سلسلۂ اشاعتِ قرآن حیدرآباد دکن

ماہ صفر المظفر سنہ ۱۳۴۹ ھ

ارتقاء انسان

اور

قرآن

مرتبہ

ابو محمد مصلح کان اللہ لہٗ

دفتر

قرآنی تحریک حیدرآباد دکن

چندہ

سالانہ دس روپیے۔ ماہوار پورے سٹ کی قیمت ایک روپیہ

تہدیہ

(☙)

سلسلۂ اشاعت قرآن'' کا یہ مکمل تیسرا ایڈیشن جناب حاجی نواب ولی داد خاں صاحب
بہادر مندوزئی جاگیردار (حیدرآباد دکن) کی مالی امداد سے شائع
کیا جا رہا ہے۔

اللّٰھم اجرہ اجراً کثیراً

دعا گو

ابو محمد مصلح

اطمینانِ قلب

نئی روشنی والے خصوصاً اور عام لوگ عموماً تسکینِ دل اور اطمینانِ قلب ہی کی خاطر سب کچھ
کر رہے ہیں مگر ان کی من مانی جد و جہد اور طلب ان کے ساتھ برعکس معاملہ کرتی ہے حقیقت
یہ ہے کہ آج یورپ و امریکہ" والوں کو بھی اطمینانِ قلب نصیب نہیں پھر غریب مقلدین کو کون پوچھے
قرآن مجید اطمینانِ قلب کو سب سے بڑی دولت اور جنس گرانمایہ بتلاتا ہے ولذکر اللہ اکبر پھر یہی ہے
ذکر اللہ تطمئن القلوب۔ یعنی اللہ کا ذکر بڑی چیز ہے اور اطمینانِ قلب کے لئے بھی
یہی ہے اور باقی سب ہیچ اور غلط۔

ذکر اور اللہ کی یاد ایک ہی چیز ہے اور یہ جہاں نہ ہو وہاں کچھ بھی نہیں
برباد ہے آباد نہ ہو آباد نہ ہو — جس لب پہ خدا کا ذکر نہ ہو جس دل میں خدا کی یاد نہ ہو
ذکر کا نام قرآن مجید ہے اور اسی کو نوع انسان کے سرور کیلئے نازل کیا گیا ہے اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ۔
یہ ہے کہ اگر اقوامِ عالم اطمینانِ قلب چاہیں تو انہیں چاہیئے کہ قرآن مجید کی طرف متوجہ ہوں۔
قلب اور اطمینانِ نفس ساتھ ایک چیز ہیں اور نفس کی یہ حالت اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک مجموعہ
قرآن کے ذریعہ تزکیہ نہ ہو جائے۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى وَ ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى یہی وہ نفس ہے
ن میں ارشاد ہے۔ يٰۤاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِيْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً فَادْخُلِيْ فِيْ
وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ۔ نفسِ مطمئنہ بجا آوری اوامر اور اجتناب نواہی سے حاصل ہوتا ہے اور یہ چیز کامل طور پر قرآن
ائی دوسری آسمانی کتاب میسر نہیں کرتی اسلئے جس کسی کو اطمینانِ قلب کی ضرورت ہو اسکو قرآن مجید کا
لازمی ہے۔ دنیا محکومیتِ الٰہی اور محبتِ الٰہی سے امن و سکون کی جگہ بن گئی ہے۔ اور انسان "انسانیت" کے
قرآن مجید کے ذریعہ اپنی پیدائش کی غرض و غایت کو پورا کر سکتا ہے ارتقاء انسان اور قرآن اسی ضرورت کیلئے
ترجمہ کے مصنف اور قارئین کو اجر عظیم عطا فرمائے آمین۔ فقیر ابو محمد مصلح "دفتر قرآنی تحریک" حیدرآباد دکن

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ارتقاء انسان اور قرآن

(۱)

احسان فراموشی ہوگی اگر ابتدائے مضمون سے قبل
مختصر طور پر اسلام کی اس محترم اور برگزیدہ
شخصیت کے فیوض و برکات کا اعتراف نہ کیا جائے
جس کی خیرہ کن ضیا باریاں اور تحیّر زا موشگافیاں
ایک عالم کے لیے اجلائے دماغ کا سبب بنیں اور
جس نے کچھ ایسے دلآویز اور روح پرور انداز میں
بصارت افروز و بصیرت آفریں ہو کر منزل مقصود
کی صراطِ مستقیم سے ہمیں روشناس کرایا کہ کہا جا سکتا
ہے کہ دیدۂ بینا اور تجلّی محبوب کے درمیان اب کوئی
حجاب حائل نہیں رہا بجز اس کے کہ کوئی بدبخت

خود آنکھیں بند کرلے یا تعصب اور جہالت کی عینک
لگائے۔

ایسی صورت میں نہایت ضروری ہے کہ آپ کی تعلیم کو
مختلف طرق اور ذرائع سے دنیا کے سامنے پیش
کیا جائے،

سطور مندرجہ ذیل ہدیہ ناظرین کرنے سے میرا یہی
مقصد ہے کہ زیادہ سے زیادہ کانوں تک یہ آواز
پہنچ سکے جس سے خالق و مخلوق کا تعلق از سر نو تازہ
اور مضبوط کرنے کی ہوس اور ہمت پیدا ہو جائے۔"

یہ حقیقت مسلمہ ہے کہ ہر انسان کو رہگذر حیات میں تین منزلوں سے
واسطہ پڑتا ہے، جن کو دوسرے الفاظ میں طبعی، اخلاقی اور روحانی احساسات
یا جذبات کہہ سکتے ہیں"

خدائے تعالیٰ کے پاک کلام قرآن شریف نے ان تین حالتوں
کی تقسیم اس طرح پر کی ہے کہ ان تینوں کے لئے علحدہ علحدہ تین مبدء
ٹھہرائے ہیں یا یوں کہو کہ تین سرچشمے قرار دیئے ہیں جن میں سے جدا جدا
یہ حالتیں نکلتی ہیں۔ چنانچہ:۔

پہلا سرچشمہ جو طبعی حالتوں کا مصدر ہے اس کا نام قرآن شریف
نے نفس امارہ رکھا ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ
بِالسُّوْٓءِ یعنی نفس امارہ میں یہ خاصیت ہے کہ وہ انسان کو بدی کی طرف (جو انسان کی

کمال کے مخالف اور اُس کی اخلاقی حالتوں کے برعکس ہے) جھکاتا ہے۔ اور
ناپسندیدہ اور بدراہوں پر چلانا چاہتا ہے، غرض بے اعتدالیوں اور بدیوں
کی طرف جانا انسان کی ایک حالت ہے جو اخلاقی حالت سے پہلے اُس پر
طبعاً غالب ہوتی ہے اور یہ حالت اُس وقت تک طبعی حالت کہلاتی ہے
جب تک انسان عقل اور معرفت کے زیرسایہ نہیں چلتا بلکہ چارپایوں کی طرح
کھانے، پینے، سونے، جاگنے یا غصہ اور جوش دکھانے وغیرہ امور میں طبعی
جذبات کا پیرو رہتا ہے اور جب انسان عقل اور معرفت کے مشورہ سے طبعی
حالتوں میں تصرف کرتا اور اعتدال مطلوب کی رعایت رکھتا ہے۔ اُس وقت
اِن حالتوں کا نام طبعی حالتیں نہیں رہتا، بلکہ اُس وقت یہ حالتیں اخلاقی
حالتیں کہلاتی ہیں۔ جیساکہ آگے بھی کچھ اس کا ذکر آئے گا۔"

دوسرا سرچشمہ جو اخلاقی حالتوں کا مصدر ہے اُس کا نام
قرآن شریف میں نفس لوّامہ ہے جیساکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ وَلَآ
اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةِ یعنی میں اُس نفس کی قسم کھاتا ہوں جو بدی کے
کام اور ہر ایک بے اعتدالی پر اپنے تئیں ملامت کرتا ہے، یہ نفس لوّامہ انسانی
حالتوں کا دوسرا سرچشمہ ہے جس سے اخلاقی حالتیں پیدا ہوتی ہیں اور اس
مرتبہ پر انسان دوسرے حیوانات کی مشابہت سے نجات پاتا ہے، اس جگہ
نفس لوّامہ کی قسم کھانا اُس کو عزت دینے کے لئے ہے گویا وہ نفس امّارہ
سے نفس لوّامہ بن کر بوجہ اس ترقی کے جناب الٰہی میں عزت پانے کے
لائق ہو گیا اور اُس کا نام لوّامہ اس لئے رکھا گیا کہ وہ انسان کو بدی کی ملامت

کرتا ہے اور اس بات پر راضی نہیں ہوتا کہ انسان اپنے طبعی لوازم میں شتر بے مہار کی طرح چلے اور چارپایوں کی زندگی بسر کرے بلکہ یہ چاہتا ہے کہ اُس سے اچھی حالتیں اور اچھے اخلاق صادر ہوں اور انسانی زندگی کے تمام لوازم میں کوئی بے اعتدالی ظہور میں نہ آئے اور طبعی جذبات اور طبعی خواہشیں عقل کے مشورہ سے ظہور پذیر ہوں، پس چونکہ وہ بری حرکت پر ملامت کرتا ہے اس لیے اُس کا نام نفسِ لوّامہ ہے۔ یعنی "بہت ملامت کرنیوالا"۔ یہ نفسِ لوّامہ اگرچہ طبعی جذبات پسند نہیں کرتا بلکہ اپنے تئیں ملامت کرتا رہتا ہے لیکن نیکیوں کے بجالانے پر پورے طور سے قادر بھی نہیں ہو سکتا۔ اور کبھی نہ کبھی طبعی جذبات اُس پر غلبہ کر جاتے ہیں تب گر جاتا ہے اور ٹھوکر کھاتا ہے گویا وہ ایک کمزور بچے کی طرح ہوتا ہے جو گرنا نہیں چاہتا ہے مگر کمزوری کی وجہ سے گرتا ہے پھر اپنی کمزوری پر نادم ہوتا ہے غرض یہ نفس کی وہ اخلاقی حالت ہے جب نفس اخلاقِ فاضلہ کو اپنے اندر جمع کرتا ہے اور سرکشی سے بیزار ہوتا ہے مگر پورے طور پر غالب نہیں آسکتا۔

تیسرا سرچشمہ جس کو روحانی حالتوں کا مبدء کہنا چاہیے اس کا نام قرآن شریف نے نفسِ مطمئنہ رکھا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ۝ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۝ فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ ۝ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ ۝ یعنی اے نفس آرام یافتہ جو خدا سے آرام پاگیا اپنے خدا کی طرف واپس چلا آ۔ تو اُس سے راضی اور وہ تجھ سے

راضی، پس میرے بندوں میں مل جا اور میری بہشت کے اندر آجا" یہ وہ مرتبہ ہے جس میں نفس تمام کمزوریوں سے نجات پاکر روحانی قوتوں سے بھر جاتا ہے اور خدائے تعالیٰ سے ایسا پیوند کر لیتا ہے کہ بغیر اس کے جی بھی نہیں سکتا اور جس طرح پانی اوپر سے نیچے کی طرف بہتا اور بہ سبب اپنی کثرت اور نیز روکوں کے دور ہو جانے سے بڑے زور سے چلتا ہے اسی طرح وہ خدا کی طرف بہتا چلا جاتا ہے اسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے وہ نفس جو خدا سے آرام پا گیا اس کی طرف واپس چلا آ، پس وہ اسی زندگی میں نہ موت کے بعد ایک عظیم الشان تبدیلی پیدا کرتا ہے اور اسی دنیا میں نہ دوسری جگہ ایک بہشت اس کو ملتی ہے اور جیسا کہ اس آیت میں لکھا ہے کہ تو اپنے رب کی طرف (یعنی پرورش کرنے والے کی طرف) واپس آ ایسا ہی اس وقت یہ خدا سے پرورش پاتا ہے اور خدا کی محبت اس کی غذا ہوتی ہے اور اسی زندگی بخش چشمے سے پانی پیتا ہے اس لئے موت سے نجات پاتا ہے جیسا کہ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا یعنی جس نے ارضی جذبات سے اپنے نفس کو پاک کیا وہ بچ گیا اور نہیں ہلاک ہوگا مگر جس نے ارضی جذبات میں جو طبعی جذبات ہیں اپنے تئیں چھپا دیا وہ زندگی سے ناامید ہو گیا۔

غرض یہ تین حالتیں ہیں جن کو دوسرے لفظوں میں طبعی اور اخلاقی اور روحانی حالتیں کہہ سکتے ہیں اور چونکہ طبعی تقاضے افراط کے وقت بہت خطرناک ہو جاتے ہیں اور بسا اوقات اخلاق اور روحانیات کا

ستیاناس کر دیتے ہیں اس لئے خدائے تعالیٰ کی پاک کتاب میں اُن کو نفسِ
امارہ کی حالتوں سے موسوم کیا گیا اگر یہ سوال ہو کہ انسان کی طبعی حالتوں پر
قرآن شریف کا کیا اثر ہے اور وہ اُن کی نسبت کیا ہدایت دیتا ہے۔ اور
عملی طور پر کس حد تک اُن کو رکھنا چاہتا ہے تو واضح ہو کہ قرآن شریف کی
رُو سے انسان کی طبعی حالتوں کو اُس کی اخلاقی اور روحانی حالتوں سے
نہایت ہی شدید تعلقات واقع ہیں یہاں تک کہ انسان کے کھانے پینے
کے طریقے بھی انسان کی اخلاقی و روحانی حالتوں پر اثر کرتے ہیں اور اگر ان
طبعی حالتوں سے شریعت کی ہدایتوں کے موافق کام لیا جائے تو جیسا کہ نمک
کی کان میں پڑکر ہر ایک چیز نمک ہی ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی یہ تمام حالتیں
اخلاقی ہی ہو جاتی ہیں اور روحانیت پر نہایت گہرا اثر کرتی ہیں۔ اسی واسطے
قرآن شریف نے تمام عبادات اور اندرونی پاکیزگی کے اغراض اور خشوع و
خضوع کے مقاصد میں جسمانی طہارتوں اور جسمانی آداب اور جسمانی تعدیل کو
بہت ملحوظ رکھا ہے اور غور کرنے کے وقت یہی فلاسفی نہایت صحیح معلوم
ہوتی ہے کہ جسمانی اوضاع کا رُوح پر بہت قوی اثر ہے جیسا کہ ہم دیکھتے
ہیں کہ ہمارے طبعی افعال گو بظاہر جسمانی ہیں مگر ہماری روحانی حالتوں پر
ضرور ان کا اثر ہے۔ مثلاً جب ہماری آنکھیں رونا شروع کریں اور گو تکلف
سے ہی روئیں مگر فی الفور ان آنسوؤں کا ایک شعلہ اُٹھ کر دل پر جا پڑتا ہے
تب دل بھی آنکھوں کی پیروی کر کے غمگین ہو جاتا ہے ایسا ہی جب ہم تکلف سے
ہنسنا شروع کریں تو دل میں بھی ایک انبساط پیدا ہو جاتا ہے یہ بھی دیکھا

جاتا ہے کہ جسمانی سجدہ بھی روح میں خشوع اور عاجزی کی حالت پیدا کرتا ہے
اس کے مقابل پر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ جب ہم گردن کو اونچی کھینچ کر اور
چھاتی کو اُبھار کر چلیں تو یہ وضع رفتار ہم میں ایک قسم کا تکبر اور خود بینی پیدا
کرتی ہے تو ان نمونوں سے پورے انکشاف کے ساتھ کھل جاتا ہے۔ کہ
بیشک جسمانی اوضاع کا روحانی حالتوں پر اثر ہے۔ ایسا ہی تجربہ ہم پر ظاہر
کرتا ہے کہ طرح طرح کی غذاؤں کا بھی دماغی اور دلی قوتوں پر ضرور اثر ہے
مثلاً ذرا غور سے دیکھنا چاہیئے کہ جو لوگ کبھی گوشت نہیں کھاتے رفتہ رفتہ
اُن کی شجاعت کی قوت کم ہوتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ نہایت دل کے کمزور
ہو جاتے ہیں اور ایک خدا داد اور قابل تعریف قوت کو کھو بیٹھتے ہیں، اسکی
شہادت خدا کے قانون قدرت سے اس طرح پر ملتی ہے کہ چارپایوں میں سے
جس قدر گھاس خور جانور ہیں کوئی بھی ان میں سے وہ شجاعت نہیں رکھتا
جو ایک گوشت خوار جانور رکھتا ہے، پرندوں میں بھی یہی بات مشاہدہ
ہوتی ہے، پس اس میں کیا شک ہے کہ اخلاق پر غذاؤں کا اثر ہے۔ ہاں
جو لوگ دن رات گوشت خوری پر زور دیتے ہیں اور نباتی غذاؤں سے
بہت ہی کم حصہ رکھتے ہیں وہ بھی حلم اور انکسار کے خلق میں کم ہو جاتے ہیں
اور میانہ روش کو اختیار کرنے والے دونوں خلق کے وارث ہوتے ہیں
اسی حکمت سے خدا تعالیٰ قرآن شریف میں فرماتا ہے کُلُوْا وَاشْرَبُوْا
وَلَا تُسْرِفُوْا یعنی گوشت بھی کھاؤ اور دوسری چیزیں بھی کھاؤ مگر کسی چیز کی
حد سے زیادہ کثرت نہ کرو تا اُس کا اخلاقی حالت پر بد اثر نہ پڑے اور تا یہ کثرت

مضر صحت بھی نہ ہو، اور جیسا کہ جسمانی افعال اور اعمال کا روح پر اثر پڑتا ہے ایسا ہی کبھی روح کا اثر بھی جسم پر جا پڑتا ہے، جس شخص کو کوئی غم پہنچے۔ آخر وہ چشم پُرآب ہو جاتا ہے اور جس کو خوشی ہو آخر وہ تبسم کرتا ہے جس قدر ہمارا کھانا پینا، سونا، جاگنا، حرکت کرنا، آرام کرنا، غسل کرنا وغیرہ افعال طبعیہ ہیں یہ تمام افعال ضروری ہمارے روحانی حالات پر اثر کرتے ہیں، ہماری جسمانی بناوٹ کا جاری انسانیت سے بڑا تعلق ہے۔ دماغ کے ایک مقام پر چوٹ لگنے سے یک لخت حافظہ جاتا ہے اور دوسرے مقام پر چوٹ لگنے سے ہوش و حواس رخصت ہوتے ہیں۔ وبائی ایک زہریلی ہوا کس قدر جلد جسم میں اثر کرکے پھر دل میں اثر کرتی ہے اور دیکھتے دیکھتے وہ اندرونی سلسلہ جس کے ساتھ تمام نظام اخلاق کا ہے درہم برہم ہونے لگتا ہے یہاں تک کہ انسان دیوانہ سا ہو کر چند منٹ میں گذر جاتا ہے۔ غرض جسمانی صدمات بھی عجیب نظارہ دکھاتے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ روح اور جسم کا ایک ایسا تعلق ہے کہ اس راز کو کھولنا انسان کا کام نہیں اس سے زیادہ اس تعلق کے ثبوت پر یہ دلیل ہے کہ غور سے معلوم ہوتا ہے کہ روح کی ماں جسم ہی ہے حاملہ عورتوں کے پیٹ میں روح کبھی اوپر سے نہیں گرتی بلکہ وہ ایک نور ہے جو نطفہ میں ہی پوشیدہ طور پر مخفی ہوتا ہے اور جسم کی نشوونما کے ساتھ چمکتا جاتا ہے۔ خدا تعالےٰ کا پاک کلام ہمیں سمجھاتا ہے کہ رُوح اُس قالب میں سے ہی ظہور پذیر ہو جاتی ہے جو نطفہ سے رحم میں تیار ہوتا ہے۔ جیسا کہ وہ قرآن شریف میں فرماتا ہے۔ ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخٰلِقِیْنَ ؕ یعنی پھر ہم

اُس جسم کو جو رحم میں تیار ہوا تھا ایک اور پیدایش کے رنگ میں لاتے ہیں اور ایک اور خلقت اس کی ظاہر کرتے ہیں جو روح کے نام سے موسوم ہے اور خدا بہت برکتوں والا ہے اور ایسا خالق ہے کہ کوئی اُس کے برابر نہیں۔

اور یہ جو فرمایا کہ ہم اُس جسم میں سے ایک اور پیدایش ظاہر کرتے ہیں یہ ایک گہرا راز ہے جو روح کی حقیقت کو دکھلا رہا ہے اور اُن نہایت مستحکم تعلقات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ جو جسم کے درمیان واقع ہیں اور یہ اشارہ ہمیں اس بات کی بھی تعلیم دیتا ہے کہ انسان کے جسمانی اعمال اور اور اقوال اور تمام طبعی افعال جب خدائے تعالےٰ کے لیے اور اس کی راہ میں ظاہر ہونے شروع ہوں ان سے بھی یہی الٰہی فلاسفی متعلق ہے۔ یعنی ان مخلصانہ اعمال میں بھی ابتدا ہی سے ایک روح مخفی ہوتی ہے۔ جیسا کہ نطفہ میں مخفی تھی اور جیسے جیسے ان اعمال کا قالب تیار ہوتا ہے وہ روح چمکتی جاتی ہے اور جب وہ قالب پورا تیار ہو چکتا ہے تو ایک دفعہ وہ روح اپنی کامل تجلی کے ساتھ چمک اُٹھتی ہے اور اپنی روحی حیثیت سے اپنے وجود کو دکھا دیتی ہے اور زندگی کی صریح حرکت شروع ہو جاتی ہے، جب ہی کہ اعمال کا پورا قالب تیار ہو جاتا ہے۔ معاً بجلی کی طرح ایک چیز اندر سے اپنی کھلی کھلی چمک دکھانا شروع کر دیتی ہے، یہ وہی زمانہ ہوتا ہے جس کی نسبت اللہ تعالیٰ قرآن شریف میں

مثالی طور سے فرماتا ہے۔ فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ۔ یعنی میں نے اُسکا قالب بنا لیا اور تجلیات کے تمام مظاہر درست کر لیے اور اپنی روح اُس میں پھونک دی تو تم سب لوگ اُس کے لئے زمین پر سجدہ کرتے ہوئے گر جاؤ۔ سو اِس آیت میں یہی اشارہ ہے کہ جب اعمال کا پورا قالب تیار ہو جاتا ہے تو اس قالب میں وہ روح چمک اُٹھتی ہے جس کو خدا تعالےٰ اپنی ذات کی طرف منسوب کرتا ہے کیونکہ دنیوی زندگی کی فنا کے بعد وہ قالب تیار ہوتا ہے اس لئے الٰہی روشنی جو پہلے دھیمی تھی یک دفعہ بھڑک اٹھتی ہے اور واجب ہوتا ہے کہ خدا کی ایسی شان کو دیکھ کر ہر ایک سجدہ کرے اور اس کی طرف کھینچا جائے سو ہر ایک اس نور کو دیکھ کر سجدہ کرتا ہے اور طبعاً اس طرف آتا ہے بجز ابلیس کے جو تاریکی سے دوستی رکھتا ہے، پھر میں پہلی بات کی طرف رجوع کر کے بیان کرتا ہوں کہ یہ بات نہایت درست اور صحیح ہے کہ روح ایک لطیف نور ہے جو اُس جسم کے اندر ہی سے پیدا ہو جاتا ہے جو رحم میں پرورش پاتا ہے پیدا ہونے سے یہ مُراد ہے کہ اول مخفی اور غیر محسوس ہوتا ہے پھر نمایاں ہو جاتا ہے اور ابتدائی اُس کا خمیر نطفہ میں موجود ہوتا ہے۔ بیشک وہ آسمانی خدا کے ارادہ سے اور اُس کے اِذن اور اس کی مشیت سے ایک مجہول الکنہ علاقہ کے ساتھ نطفہ سے تعلق رکھتا ہے اور نطفہ کا وہ روشن اور نورانی جوہر ہے۔ نہیں کہہ سکتے کہ وہ نطفہ کی ایسی چیز ہے جیسا کہ جسم جسم کا جزو ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ وہ باہر سے آتا ہے یا زمین پر گر کر

نطفہ کے مادہ سے آمیزش پاتا ہے بلکہ وہ ایسا نطفہ میں مخفی ہوتا ہے جیسا کہ
آگ پتھر کے اندر ہوتی ہے خدا کی کتاب کا یہ منشا نہیں ہے کہ روح الگ
طور پر آسمان سے نازل ہوتی ہے یا فضا سے زمین پر گرتی ہے اور پھر کسی
اتفاق سے نطفہ کے ساتھ مل کر رحم کے اندر چلی جاتی ہے بلکہ یہ خیال کسی
طرح صحیح نہیں ٹھہر سکتا۔ اگر ہم ایسا خیال کریں تو قانونِ قدرت ہمیں باطل پر
ٹھہراتا ہے ہم روز مشاہدہ کرتے ہیں کہ گندے اور باسی کھانوں میں اور گندے
زخموں میں ہزارہا کیڑے پڑ جاتے ہیں میلے کپڑوں میں صد ہا جوئیں پڑ جاتی
ہیں۔ انسان کے پیٹ کے اندر بھی کدو دانے وغیرہ پیدا ہو جاتے ہیں
اب کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ باہر سے آتے ہیں یا آسمان سے اترتے کسی کو
دکھائی دیتے ہیں؟ سو صحیح یہی بات ہے کہ روح جسم میں سے ہی
نکلتی ہے اور اسی دلیل سے اس کا مخلوق ہونا بھی ثابت ہوتا ہے
اب اس وقت ہمارا مطلب اس بیان سے یہ ہے کہ جس قادر مطلق نے روح
کو قدرتِ کاملہ کے ساتھ جسم میں سے ہی نکالا ہے اس کا یہی ارادہ معلوم
ہوتا ہے کہ روح کی دوسری پیدائش کو بھی جسم ہی کے ذریعہ سے ظہور
میں لائے روح کی حرکتیں ہمارے جسم کی حرکتوں پر موقوف ہیں جس طرف
ہم جسم کو کھینچتے ہیں روح بھی بالضرورت پیچھے پیچھے کھنچی چلی آتی ہے
اس لیئے انسان کی طبعی حالتوں کی طرف متوجہ ہونا خدا تعالیٰ کی سچی کتاب کا
کام ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف نے انسان کی طبعی حالتوں کی
اصلاح کے لیئے بہت توجہ فرمائی ہے اور انسان کا ہنسنا، رونا، کھانا،

پینا، پہننا، سونا، بولنا، چپ رہنا، بیوی کرنا، مجرد رہنا، چلنا، ٹھہرنا، اور ظاہری پاکیزگی غسل وغیرہ کی شرائط بجالانا اور بیماری کی حالت اور صحت کی حالت میں خاص خاص امور کا پابند ہونا، اِن سب باتوں پر ہدایتیں لکھی ہیں اور انسان کی جسمانی حالتوں کو روحانی حالتوں پر بہت ہی موثر قرار دیا ہے اگر ان ہدایتوں کو تفصیل سے لکھا جائے تو میں خیال نہیں کرسکتا کہ اس مضمون کے کمتل کرنے کے لئے کوئی وقت کافی مل سکے۔

میں جب خدا کے پاک کلام پر غور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ کیونکر اُس نے اپنی تعلیموں میں انسان کو اس کی طبعی حالتوں کی اصلاح کے قواعد عطا فرما کر پھر آہستہ آہستہ اوپر کی طرف کھینچا ہے اور اعلیٰ درجہ کی روحانی حالت تک پہنچانا چاہا ہے تو مجھے یہ پُر معرفت قاعدہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ اوّل خدا نے یہ چاہا ہے کہ انسان کو نشست و برخاست اور کھانے پینے اور بات چیت اور تمام اقسام معاشرت کے طریق سکھا کر اُس کو وحشیانہ طریقوں سے نجات دے اور حیوانات کی مشابہت سے تمیز کلی بخشکر ایک ادنیٰ درجہ کی اخلاقی حالت جس کو ادب اور شائستگی کے نام سے موسوم کرسکتے ہیں سکھائے، پھر انسان کی نیچرل عادات کو جن کو دوسرے لفظوں میں اخلاق رذیلہ کہہ سکتے ہیں اعتدال پر لائے تاکہ وہ اعتدال پاکر اخلاقِ فاضلہ کے رنگ میں آجائیں مگر یہ دونوں طریقے دراصل ایک ہی ہیں کیونکہ طبعی حالتوں کے متعلق ہیں صرف ادنیٰ اور اعلیٰ درجہ کے فرق نے ان کو دو قسم بنا دیا ہے اور اُس حکیم مطلق نے اخلاق کے

نظام کو ایسے طور سے پیش کیا ہے کہ جس سے انسان ادنیٰ خُلق سے اعلیٰ خُلق تک ترقی کر سکے۔

اور پھر تیسرا مرحلہ ترقیات کا یہ رکھا ہے کہ انسان اپنے خالق حقیقی کی محبت اور رضا میں محو ہو جائے اور سب وجود اس کا خدا کیلئے ہو جائے یہ وہ مرتبہ ہے جس کو یاد دلانے کے لئے مسلمانوں کے دین کا نام اسلام رکھا گیا ہے کیونکہ اسلام اس بات کو کہتے ہیں کہ بکلی خدا کے لئے ہو جانا اور اپنا کچھ باقی نہ رہنا۔ جیسا کہ اللہ جل جلالہٗ فرماتا ہے بَلٰی مَنْ اَسْلَمَ وَجْھَہٗ لِلّٰہِ وَھُوَ مُحْسِنٌ فَلَہٗٓ اَجْرُہٗ عِنْدَ رَبِّہٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۔ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ وَاَنَّ ھٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا ۔ فَاتَّبِعُوْہُ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِکُمْ عَنْ سَبِیْلِہٖ ۔ قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۔ ترجمہ یعنی نجات یافتہ وہ شخص ہے جو اپنے وجود کو خدا کے لئے اور خدا کی راہ میں قربانی کی طرح رکھدے اور نہ صرف نیت سے بلکہ نیک کاموں سے اپنے صدق کو دکھا دے جو شخص ایسا کرے اُس کا بدلہ خدا کے نزدیک مقرر ہو چکا اور ایسے لوگوں پر نہ کچھ خوف ہے اور نہ کچھ غمگیں ہوں گے (اے محمد صلعم) کہہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا زندہ رہنا اور میرا مرنا اس خدا کے لئے ہے جس کی ربوبیت تمام چیزوں پر محیط ہے۔ کوئی چیز اور کوئی شخص

اُس کا شریک نہیں۔ اور مخلوق کو کسی قسم کی شراکت اس کے ساتھ نہیں مجھے یہی حکم ہے کہ میں ایسا کروں اور اسلام کے مفہوم پر قائم ہونے والا یعنی خدا کی راہ میں اپنے وجود کی قربانی دینے والا سب سے اول میں ہوں۔

یہ میری راہ ہے۔ سو آؤ میری راہ اختیار کرو اور اس کے مخالف کوئی راہ اختیار نہ کرو کہ خدا سے دور، جا پڑو گے (اے محمد صلعم) ان کو کہدے کہ اگر خدا سے پیار کرتے ہو تو آؤ میرے پیچھے ہولو اور میری راہ پر چلو تا کہ خدا بھی تم سے پیار کرے اور تمھارے گناہ بخشے اور وہ تو بخشندہ اور رحیم ہے۔"

اب ہم انسان کے اِن تین مرحلوں کا جدا جدا بیان کریں گے لیکن اول یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ طبعی حالتیں جن کا سرچشمہ اور مبدء نفس امّارہ ہے۔ خدائے تعالیٰ کے پاک کلام کے اشارات کے موافق اخلاقی حالتوں سے کوئی الگ چیز نہیں ہیں کیونکہ خدا کے پاک کلام نے تمام نیچرل قوائے اور جسمانی خواہشوں اور تقاضوں کو طبعی حالات کے مد میں رکھا ہے اور وہی طبعی حالتیں ہیں جو بالارادہ تربیت اور تعدیل اور موقع بینی اور محل پر استعمال کرنے کے بعد اخلاق کا رنگ پکڑ لیتی ہیں۔ ایسا ہی اخلاقی حالتیں روحانی حالتوں سے کوئی الگ باتیں نہیں ہیں بلکہ وہی اخلاقی حالتیں ہیں جو پورے فنافی اللہ اور تزکیہ نفس اور پورے انقطاع الی اللہ اور پوری محبت اور پوری محویت اور پوری سکینت اور اطمینان اور پوری موافقت باللہ سے روحانیت کا رنگ پکڑ لیتی ہیں۔ طبعی حالتیں جب تک اخلاقی رنگ میں نہ آ جائیں

کسی طرح انسان کو قابل تعریف نہیں بنا تیں کیونکہ وہ دوسرے حیوانات پر بلکہ جمادات میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ایسا ہی مجرد اخلاق کا حاصل کرنا بھی انسان کو روحانی زندگی نہیں بخشتا۔ بلکہ ایک شخص خدا تعالٰے کے وجود سے بھی منکر رہ کر اچھے اخلاق دکھا سکتا ہے دل کا غریب ہونا یا دل کا حلیم ہونا یا صلح کار ہونا یا ترک شر کرنا اور شریر کے مقابلہ پر نہ آنا یہ تمام طبعی حالتیں ہیں اور ایسی باتیں ہیں جو ایک نااہل کو بھی حاصل ہو سکتی ہیں جو اصل سرچشمۂ نجات سے بے نصیب اور ناآشنا محض ہے اور بہت سے چارپائے غریب بھی ہوتے ہیں اور سکھلنے اور حکم پذیر ہونے سے صلح کاری بھی دکھاتے ہیں سوٹے پر سوٹا مارنے سے کوئی مقابلہ نہیں کرتے مگر پھر بھی ان کو انسان نہیں کہہ سکتے۔ چہ جائیکہ ان خصلتوں سے وہ اعلیٰ درجہ کے انسان بن سکیں، ایسا ہی بد سے بدعقیدہ والا بلکہ بعض بدکاریوں کا مرتکب اِن باتوں کا پابند ہو سکتا ہے ممکن ہے کہ انسان رحم میں اس حد تک پہنچ جائے کہ اگر اس کے اپنے ہی زخم میں کیڑے پڑیں تو ان کو بھی قتل کرنا روا نہ رکھے اور جانداروں کی پاسداری اس قدر کرے کہ جوئیں جو سر میں پڑتی ہیں یا وہ کیڑے جو پیٹ اور انتڑیوں میں اور دماغ میں پیدا ہوتے ہیں۔ اُن کو بھی آزار اپنا چاہیے بلکہ میں قبول کر سکتا ہوں کہ کسی کا رحم اس حد تک پہنچے کہ وہ شہد کھانا ترک کردے کیونکہ وہ بہت سی جانوں کے تلف ہونے اور غریب مکھیوں کو اُن کے استھان سے پراگندہ کرنے کے بعد حاصل ہوتا ہے۔ اور میں مانتا ہوں کہ

کوئی مشک سے بھی پرہیز کرے کیونکہ وہ غریب ہرن کا خون ہے اور اُس غریب کو قتل کرنے اور بچوں سے جدا کرنے کے بعد میسر آسکتا ہے ایسا ہی مجھے اس سے بھی انکار نہیں کہ کوئی موتیوں کے استعمال کو بھی چھوڑ دے اور ابریشم کا پہننا بھی ترک کرے کیونکہ یہ دونوں غریب کیڑوں کے ہلاک کرنے سے ملتے ہیں۔ بلکہ میں یہاں تک مانتا ہوں کہ کوئی شخص دُکھ کے وقت جونکیں لگانے سے بھی پرہیز کرے اور آپ دکھ اٹھائے اور غریب جونکوں کی موت کا خواہاں نہ ہو یا بالآخر کوئی مانے یا نہ مانے مگر میں مانتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اس قدر رحم کو کمال کے نقطہ تک پہنچا دے کہ پانی پینا چھوڑ دے اور اس طرح پانی کے کیڑوں کے بچانے کے لئے اپنے تئیں ہلاک کرے میں یہ سب کچھ قبول کرتا ہوں۔ لیکن میں ہرگز قبول نہیں کر سکتا۔ کہ یہ تمام طبعی حالتیں اخلاق کہلا سکتی ہیں یا صرف انہیں سے وہ اندرونی گند دھوئے جاتے ہیں جن کا وجود خدا کے ملنے کی روک ہے۔ میں کبھی باور نہیں کروں گا کہ اس طرح کا غریب بے آزار بننا جس میں بعض چارپایوں اور پرندوں کا کچھ نمبر زیادہ ہے۔ اعلیٰ انسانیت کے حصول کا موجب ہو سکتا ہے بلکہ میرے نزدیک یہ قانون قدرت سے لڑائی ہے اور رضا کے بھاری خلق کے برخلاف اور اس نعمت کے برخلاف ہے جو قدرت نے ہم کو عطا کی ہے بلکہ وہ روحانیت ہر ایک خلق کو محل اور موقع پر استعمال کرنے کے بعد اور پھر خدا کی راہوں میں وفاداری کے ساتھ قدم مارنے سے اور اسی کا ہو جانے سے ملتی ہے جو اس کا ہو جاتا ہے اُس کی یہی نشانی ہے کہ وہ اُس کے بغیر جی ہی

نہیں سکتا۔ عارف ایک مچھلی ہے جو خدا کے ہاتھ سے ذبح کیگئی اور اس کا پانی خدا کی محبت ہے۔

آب میں

پہلے کلام کی طرف رجوع کرتا ہوں، میں ابھی ذکر کر چکا ہوں کہ انسانی حالتوں کے سرچشمے تین ہیں۔ یعنی نفسِ امّارہ، نفس لوّامہ، نفس مطمئنہ، اور طریق اصلاح کے بھی تین ہیں۔

اول طریق اصلاح یہ کہ بے تمیز وحشیوں کو اس ادنیٰ خلق پر قایم کیا جائے کہ وہ کھانے پینے اور شادی وغیرہ تمدنی امور میں انسانیت کے طریقے پر چلیں نہ ننگے پھریں نہ کتوں کی طرح مُردار خوار ہوں نہ اور کوئی بے تمیزی ظاہر کریں۔ یہ طبعی حالتوں کی اصلاحوں میں سے ادنیٰ درجہ کی اصلاح ہے۔ یہ اس قسم کی اصلاح ہے کہ اگر مثلاً پورٹ بلیر کے جنگلی آدمیوں میں سے کسی آدمی کو انسانیت کے لوازم سکھانا ہوں تو پہلے ادنیٰ ادنیٰ اخلاق انسانیت کے اور طریق ادب سے اُن کو تعلیم دی جائے گی۔

دوسرا طریق اصلاح کا یہ ہے کہ جب کوئی شخص ظاہری آداب انسانیت حاصل کرے تو اُس کو بڑے بڑے اخلاق انسانیت سکھائے جائیں اور انسانی قوٰے میں جو کچھ بھرا پڑا ہے اُن سب کو محل اور موقع پر استعمال کرنے کی تعلیم دی جائے،

تیسرا طریق اصلاح کا یہ ہے کہ جو لوگ اخلاق فاضلہ سے متصف ہوگئے ہیں ایسے خشک زاہدوں کو شربتِ محبت اور وصل کا مزہ چکھایا جائے، یہ تین اصلاحیں ہیں جو قرآن شریف نے بیان فرمائی ہیں۔ ہمارے سید ومولیٰ نبی صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ ایسے وقت میں مبعوث ہوئے تھے جبکہ دنیا ہر ایک پہلو سے خراب اور تباہ ہو چکی تھی جیساکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ ظَہَرَ الْفَسَادُ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ یعنی جنگل بھی بگڑ گئے اور دریا بھی بگڑ گئے۔ یہ اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ جو اہل کتاب کہلاتے ہیں وہ بھی بگڑ گئے اور جو دوسرے لوگ ہیں جن کو الہام کا پانی نہیں ملا وہ بھی بگڑ گئے۔ پس قرآن شریف کا کام دراصل مردوں کو زندہ کرنا تھا جیساکہ وہ فرماتا ہے۔ اِعْلَمُوْا اَنَّ اللّٰہَ یُحْیِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِھَا۔ یعنی یہ بات جان لو کہ اب اللہ تعالیٰ نئے سرے زمین کو بعد اس کے مرنے کے زندہ کرنے لگا ہے، اس زمانہ میں عرب کا حال نہایت درجہ کی وحشیانہ حالت تک پہنچا ہوا تھا اور کوئی نظام انسانیت کا اُن میں باقی نہیں رہا تھا اور تمام معاصی اُن کی نظر میں فخر کی جگہ تھے ایک ایک شخص صدہا بیویاں کرلیتا تھا۔ حرام کا کھانا ان کے نزدیک ایک شکار تھا ماؤں سے کے ساتھ نکاح کرنا حلال سمجھتے تھے۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ کو کہنا پڑا کہ حُرِّمَتْ عَلَیْکُمْ اُمَّھَاتُکُمْ یعنی آج مائیں تمہاری تم پر حرام ہوگئیں ایساہی وہ مُردار کھاتے تھے آدم خور بھی تھے دنیا کا کوئی گناہ نہیں جو نہیں کرتے تھے۔ اکثر معاد سے منکر تھے بہت سے اُن میں سے خدا کے وجود کے

بھی قائل نہ تھے لڑکیوں کو اپنے ہاتھ سے قتل کر دیتے تھے یتیموں کو ہلاک کر کے اُن کا مال کھاتے تھے بظاہر توانسان تھے مگر عقلیں مسلوب تھیں نہ حیا تھی نہ شرم تھی نہ غیرت تھی۔ شراب کو پانی کی طرح پیتے تھے جس کا زناکاری میں اول نمبر ہوتا وہی قوم کا رئیس کہلاتا تھا بے علمی اس قدر تھی کہ اردگرد کی تمام قوموں نے اُن کا نام اُمّی رکھ دیا تھا ایسے وقت میں اور ایسی قوموں کی اصلاح کے لئے ہمارے سیّدو مولیٰ نبی صلّی اللہ علیہ وآلہٖ واصحابہٖ وسلّم شہر مکہ میں ظہور فرما ہوئے پس وہ تین قسم کی اصلاحیں جن کا ہم ابھی ذکر کر چکے ہیں اُن کا درحقیقت یہی زمانہ تھا پس اسی وجہ سے قرآن شریف دنیا کی تمام ہدایتوں کی نسبت اکمل اور اتم ہونے کا دعویٰ کرتا ہے کیونکہ دنیا کی اور کتابوں کو ان تین قسم کی اصلاحوں کا موقع نہیں ملا۔ اور قرآن شریف کا یہ مقصد تھا کہ حیوانوں سے انسان بنادے اور انسان سے بااخلاق انسان بنادے اور بااخلاق انسان سے باخدا انسان بنادے اسی واسطے ان تین اُمور پر قرآن شریف مشتمل ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اصلاحات ثلثہ کا مفصّل بیان کریں یہ ذکر کرنا بھی ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآن شریف میں کوئی ایسی تعلیم نہیں جو زبردستی ماننی پڑے بلکہ تمام قرآن کا مقصد صرف اصلاحات ثلثہ ہیں اور اس کی تمام تعلیموں کا لبّ لباب یہی تین اصلاحیں ہیں اور باقی تمام احکام ان اصلاحوں کے لئے بطور وسائل کے ہیں اور جس طرح بعض وقت ڈاکٹر کو بھی

کو اصحت کے پیدا کرنے کے لئے کبھی چیرنے کبھی مرہم لگانے کی ضرورت پڑتی
ہے ایسا ہی قرآنی تعلیم نے بھی انسانی ہمدردی کے لئے ان لوازم کو اپنے
اپنے محل پر استعمال کیا ہے اور اس کے تمام معارف یعنی گیان کی باتیں اور
وصایا اور وسائل کا اصل مطلب یہ ہے کہ انسان کو اس کی طبعی حالتوں سے
جو وحشیانہ رنگ اپنے اندر رکھتے ہیں اخلاقی حالتوں تک پہنچائے اور پھر
اخلاقی حالتوں سے روحانیت کے ناپیدا کنار دریا تک پہنچائے، پہلے ہم
بیان کر چکے ہیں کہ طبعی حالات اخلاقی حالات سے کچھ الگ چیز نہیں
بلکہ وہی حالات ہیں جو تعدیل اور موقع و محل پر استعمال کرنے سے اور عقل
کی تجویز و مشورہ سے کام میں لانے سے اخلاقی حالات کا رنگ پکڑ لیتے
ہیں اور قبل اس کے کہ وہ عقل و معرفت کی صلاح و مشورہ سے صادر ہوں
گو وہ کیسے ہی اخلاق سے مشابہ ہوں درحقیقت اخلاق نہیں ہوتے۔ بلکہ
طبیعت کی ایک بے اختیار رفتار ہوتی ہے جیسا کہ اگر ایک کتے یا ایک
بکری سے اپنے مالک کے ساتھ محبت و انکسار ظاہر ہو تو اس کتے کو
خلیق نہیں کہیں گے اور نہ اس بکری کا نام مہذب الاخلاق رکھیں گے
اسی طرح ہم ایک بھیڑیئے یا شیر کو اس کی درندگی کی وجہ سے بدخلق نہیں
کہیں گے بلکہ جیسا کہ ذکر کیا تھا اخلاقی حالت موقع اور سوچ اور وقت شناسی
کے بعد شروع ہوتی ہے اور ایک ایسا انسان جو عقل و تدبیر سے کام
نہیں لیتا وہ ان شیرخوار بچوں کی طرح ہے جن کے دل و دماغ پر ہنوز قوت
عقلیہ کا سایہ نہیں پڑا۔ یا اُن دیوانوں کی طرح جو جوہر عقل و دانش کو کھو بیٹھے ہیں

ظاہر ہے کہ جو شخص شیر خوار بچہ یا دیوانہ ہو وہ بعض اوقات ایسی حرکات ظاہر
ہے جو اخلاق سے مشابہ ہوتی ہیں مگر کوئی عقلمند اُن کا نام اخلاق
رکھ سکتا۔ کیونکہ وہ حرکتیں تمیز اور موقع بینی کے چشمے سے نہیں نکل
بلکہ وہ طبعی طور پر تحریکوں کے پیش آنے کے وقت صادر ہوتی جا
جیسا کہ ایک انسان کا بچہ پیدا ہوتے ہی ماں کی چھاتیوں کی طرف
کرتا ہے اور ایک مرغ کا بچہ پیدا ہوتے ہی دانہ چگنے کے لئے دوڑ
جونک کا بچہ جونک کی عادتیں اپنے اندر رکھتا ہے اور سانپ کا بچہ سا
کی عادتیں ظاہر کرتا ہے اور شیر کا بچہ شیر کی عادتیں دکھلاتا ہے، بالخصو
انسان کے بچے کو غور سے دیکھنا چاہیئے کہ وہ کس طرح پیدا ہو
ہی انسانی عادتیں دکھانا شروع کر دیتا ہے اور پھر جب برس ڈیڑھ
کا ہوا۔ تو وہ عادات طبعیہ بہت نمایاں ہو جاتی ہیں مثلاً پہلے جس طر
روتا تھا اب رونا بہ نسبت پہلے کے کسی قدر بلند ہو جاتا ہے۔ ایسے
ہنسنا قہقہہ کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور آنکھوں میں بھی عمداً د
کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں اور ایک اور امر طبعی پیدا ہو جاتا ہے کہ
رضامندی یا نارضامندی حرکات سے ظاہر کرتا ہے اور کسی کو مارتا کسی
کچھ دینا چاہتا ہے مگر یہ تمام حرکات دراصل طبعی ہوتی ہیں پس ایسے
کی مانند ایک وحشی آدمی بھی جس کو انسانی تمیز سے بہت ہی کم حصہ
وہ بھی اپنے ہر قول و فعل اور حرکت و سکون میں طبعی حرکات ہی دکھا
اور اپنی طبیعت کے جذبات کا تابع رہتا ہے کوئی بات اس کے اندر

کو اپنی کے تدبر اور تفکر سے نہیں نکلتی بلکہ جو کچھ طبعی طور پر اس کے اندر پیدا
اسے وہ خارجی تحریکوں کے مناسب حال نکلتا چلا جاتا ہے، یہ ممکن ہے
اس کے طبعی جذبات جو اس کے اندر سے کسی تحریک سے باہر آتے ہیں
سب کے سب برے نہ ہوں بلکہ بعض نیک اخلاق سے مشابہ ہوں لیکن
فلانہ تدبر اور ہوشمندی کو ان میں دخل نہیں ہوتا اور اگر کسی قدر ہو بھی تو وہ
یہ غلبہ جذبات طبعی قابلِ اعتبار نہیں ہوتا بلکہ جس طرف کثرت ہے اسیکو
سمجھا جائے گا، غرض ایسے شخص کی طرف حقیقی اخلاق منسوب نہیں کر سکتے
ان پر جذباتِ طبعیہ حیوانوں اور بچوں اور دیوانوں کی طرح غالب ہیں اور جو
اپنی زندگی کو قریب قریب وحشیوں کے طریقہ پر بسر کرتا ہے بلکہ حقیقی طور پر نیک
بد اخلاق کا زمانہ اس وقت سے شروع ہوتا ہے کہ جب انسان کی عقل عمدا ور
پختہ ہو کر اس کے ذریعے سے نیکی اور بدی یا دو بدیوں اور دو نیکیوں کے
درجہ میں فرق کر سکے پھر اچھی راہ کو ترک کرنے سے اپنے دل میں ایک حسرت
پائے اور برے کام کے ارتکاب سے اپنے تئیں نادم اور پشیمان دیکھے، یہ
انسان کی زندگی کا دوسرا زمانہ ہے جس کو خدا کے پاک کلام قرآن شریف
میں نفس لوامہ کے نام سے تعبیر کیا گیا ہے مگر یاد رہے کہ ایک وحشی کو
نفس لوامہ کی حالت تک پہنچانے کے لئے صرف سرسری نصائح کافی نہیں
بلکہ ضروری ہے کہ اس کو خدا شناسی کا اس قدر حصہ ملے جس سے وہ اپنی
پیدائش بیہودہ اور عبث خیال نہ کرے تاکہ معرفتِ الٰہی سے سچے اخلاق پیدا
ہوں اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے ساتھ ساتھ سچے خدا کی معرفت کے لئے

توجہ دلائی ہے اور یقین دلایا ہے کہ ہر عمل اور خُلق نتیجہ رکھتا ہے جو اس زندگی میں روحانی راحت یا روحانی عذاب کا موجب ہوتا ہے اور دوسری زندگی میں کھلے کھلے طور پر اپنا اثر دکھائیگا۔ غرض نفس لوّامہ کے درجہ پر انسان کو عقل و معرفت اور پاک کانشنس سے اس قدر حصہ حاصل ہوتا ہے کہ وہ بُرے کام پر اپنے تئیں ملامت کرتا ہے اور نیک کام کا خواہشمند اور حریص رہتا ہے یہ وہی درجہ ہے جس میں انسان اخلاق فاضلہ حاصل کرتا ہے۔

اس جگہ بہتر ہوگا کہ میں خُلق کے لفظ کی بھی کسی قدر تعریف کردوں سو جاننا چاہیے کہ خَلق خا کے فتح سے ظاہری پیدایش کا نام ہے اور خُلق خا کے ضمہ سے باطنی پیدایش کا نام ہے اور چونکہ باطنی پیدایش اخلاق سے ہی کمال کو پہنچتی ہے نہ صرف طبعی جذبات سے اس لئے اخلاق پر ہی یہ لفظ بولا گیا ہے طبعی جذبات پر نہیں بولا گیا' اور پھر یہ بات بھی بیان کر دینے کے لائق ہے۔ کہ جیسا کہ عوام الناس خیال کرتے ہیں کہ خُلق صرف حلیمی اور نرمی اور انکساری کا نام ہے یہ اُن کی غلطی ہے بلکہ جو کچھ بمقابلہ ظاہری اعضا کے باطن میں انسانی کمالات کی کیفیتیں رکھی گئی ہیں۔ اُن سب کیفیتوں کا نام خلق ہے مثلاً انسان آنکھ سے روتا ہے اور اُس کے مقابل دل میں ایک قوت رقت ہے وہ جب بذریعہ عقل خداداد کے اپنے محل پر مستعمل ہو تو وہ ایک خُلق ہے ایسا ہی انسان ہاتھوں سے دشمنوں کا مقابلہ کرتا ہے اور اس حرکت کے مقابل دل میں ایک قوت ہے جسکو شجاعت

کہتے ہیں پس جب انسان محل اور موقع کے لحاظ سے اس قوت کو استعمال
ہے تو اس کا نام بھی خُلق ہے اور ایسا ہی کبھی اپنے ہاتھوں سے مظ
ظالموں سے بچانا چاہتا ہے۔ یا ناداروں اور بھوکوں کو کچھ دینا چاہتا ہ
یا کسی اور طور سے بنی نوع کی خدمت کرنا چاہتا ہے اس قوت کے م
دل میں ایک قوت ہے جس کو رحم بولتے ہیں اور کبھی انسان اپنے ہات
کے ذریعہ سے ظالم کو سزا دیتا ہے۔ اس حرکت کے مقابل دل میں ا
قوت ہے جس کو انتقام کہتے ہیں اور کبھی انسان حملہ کے مقابل حملہ کر
نہیں چاہتا اور ظالم کے ظلم سے درگذر کرتا ہے اس حرکت کے مقا
دل میں قوتِ عفو وصبر ہے اور کبھی انسان بنی نوع کو فائدہ پہنچانے کیلئے
اپنے ہاتھوں سے کام لیتا ہے یا پیروں سے یا دل و دماغ سے اور ا
کی بہبودی کے لئے اپنا سرمایہ خرچ کرتا ہے تو اس حرکت کے مقابل دل
میں ایک قوت ہے جس کو سخاوت کہتے ہیں پس جب انسان ان تما
قوتوں کو موقع اور محل پر استعمال کرتا ہے تو اس وقت ان کا نام خلق ر
جاتا ہے۔ اللہ جل شانہ ہمارے نبی صَلَّی اللّٰہ عَلَیْہِ وَسَلَّمْ کو مخاط
کرکے فرماتا ہے۔ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ یعنی تو ایک بزرگ خلق پر قائم۔
سو اسی تشریح کے مطابق اس کے معنی ہیں یعنی یہ کہ تمام قسمیں اخلاق کی ت
شجاعت، عدل، رحم، احسان، صدق، حوصلہ وغیرہ تجھ میں جمع ہیں" غرض
جس قدر انسان کے دل میں قوتیں پائی جاتی ہیں جیسا کہ ادب، حیا، دیانت
مروّت، غیرت، استقامت، عفت، زہادت، اعتدال، مواسات یعنی ہمدرد

ایسا ہی شجاعت، سخاوت، عفو، صبر، احسان، صدق، وفا، وغیرہ جب یہ تمام طبعی حالتیں عقل اور تدبر کے مشورے سے اپنے اپنے محل اور موقع پر ظاہر کیئے جائیں گے تو سب کا نام اخلاق ہوگا اور یہ تمام اخلاق درحقیقت انسان کی طبعی حالتیں اور طبعی جذبات ہیں۔ صرف اُس وقت اخلاق کے نام سے موسوم ہوتے ہیں جب محل اور موقع کے لحاظ سے بالارادہ ان کو استعمال کیا جائے، چونکہ انسان کے طبعی خواص میں سے ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ ترقی پذیر جاندار ہے اس لئے وہ سچے مذہب کی پیروی اور نیک صحبتوں اور نیک تعلیموں سے ایسے طبعی جذبات کو اخلاق کے رنگ میں لے آتا ہے اور یہ امر کسی اور جاندار کے لئے نصیب نہیں"۔

قرآن شریف کی اصلاحات ثلاثہ میں سے

پہلی اصلاح

جو ادنیٰ درجہ کی طبعی حالتوں کے متعلق ہے، یہ اصلاح اخلاق کے شعبوں میں سے وہ شعبہ ہے جو آدٓب کے نام سے موسوم ہے یعنی وہ ادب جس کی پابندی وحشیوں کو ان کی طبعی حالتوں کھانے پینے اور شادی کرنے وغیرہ تمدنی امور میں مرکزِ اعتدال پر لاتی ہے اور اس زندگی سے نجات بخشتی ہے جو وحشیانہ اور چارپایوں یا درندوں کی طرح ہو۔ جیسا کہ

اِن تمام آداب کے بارے میں اللہ جل شانہ قرآن شریف میں فرماتا
ہے۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ وَعَمَّاتُكُمْ وَخَالَاتُكُمْ
وَبَنَاتُ الْأَخِ وَبَنَاتُ الْأُخْتِ وَأُمَّهَاتُكُمُ اللَّاتِي أَرْضَعْنَكُمْ وَ
أَخَوَاتُكُمْ مِنَ الرَّضَاعَةِ وَأُمَّهَاتُ نِسَائِكُمْ وَرَبَائِبُكُمُ اللَّاتِي
فِي حُجُورِكُمْ مِنْ نِسَائِكُمُ اللَّاتِي دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَإِنْ لَمْ تَكُونُوا دَخَلْتُمْ
بِهِنَّ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَائِلُ أَبْنَائِكُمُ الَّذِينَ مِنْ أَصْلَابِكُمْ
وَأَنْ تَجْمَعُوا بَيْنَ الْأُخْتَيْنِ إِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ۔ لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ
تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ۔ وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ مِنَ النِّسَاءِ إِلَّا مَا قَدْ
سَلَفَ ۔ أُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبَاتُ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الْمُؤْمِنَاتِ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ
أُوتُوا الْكِتَابَ مِنْ قَبْلِكُمْ إِذَا آتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَافِحِينَ
وَلَا مُتَّخِذِي أَخْدَانٍ ۔ وَلَا تَقْتُلُوا أَنْفُسَكُمْ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ
لَا تَدْخُلُوا بُيُوتًا غَيْرَ بُيُوتِكُمْ حَتَّى تَسْتَأْنِسُوا وَتُسَلِّمُوا عَلَى أَهْلِهَا ۔ فَإِنْ
لَمْ تَجِدُوا فِيهَا أَحَدًا فَلَا تَدْخُلُوهَا حَتَّى يُؤْذَنَ لَكُمْ وَإِنْ قِيلَ لَكُمُ ارْجِعُوا
فَارْجِعُوا هُوَ أَزْكَى لَكُمْ ۔ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا وَإِذَا حُيِّيتُمْ
بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا إِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْأَنْصَابُ
وَالْأَزْلَامُ رِجْسٌ مِنْ عَمَلِ الشَّيْطَانِ فَاجْتَنِبُوهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ
حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ
لِغَيْرِ اللَّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ
وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ يَسْأَلُونَكَ مَاذَا أُحِلَّ

لهم قل احل لكم الطيبت ۔ و اذا قيل لكم تفسحوا في المجالس
فافسحوا و اذا قيل انشزوا فانشزوا ۔ كلوا واشربوا ولا تسرفوا
و قولوا قولا سديدا ۔ و ثيابك فطهر والرجز فاهجر ۔ واغضض
من صوتك ۔ واقصد في مشيك ۔ تزودوا فان خير الزاد
التقوى ۔ وان كنتم جنبا فاطهروا ۔ وفي اموالهم حق للسائل
والمحروم ۔ وان خفتم الا تقسطوا في اليتامى فانكحوا ما طاب
لكم من النساء مثنى وثلث وربع ج وان خفتم الا تعدلوا فواحدة
او ما ملكت ايمانكم ۔ ذلك ادنى الا تعولوا ۔ واتوا النساء
صدقتهن نحلة ۔

ترجمہ- یعنی تم پر تمہاری مائیں حرام کی گئیں اور ایسا ہی تمھاری
بیٹیاں اور تمہاری بہنیں اور تمہاری پھوپھیاں اور تمہاری خالائیں اور
تمہاری بھتیجیاں اور تمہاری بھانجیاں اور تمہاری وہ مائیں جنھوں نے تمہیں
دودھ پلایا- اور تمہاری رضاعی بہنیں اور تمہاری بی بیوں کی مائیں اور تمہاری
بی بیوں کے پہلے خاوند سے لڑکیاں جن بی بیوں سے تم ہم صحبت ہو چکے
ہو اور اگر تم اُن میں سے ہم صحبت نہیں ہوئے ہو تو کوئی گناہ نہیں، اور تمہارے
حقیقی بیٹوں کی عورتیں اور ایسے ہی دو بہنیں ایک وقت میں یہ سب کام جو
پہلے ہوتے تھے آج تم پر حرام کئے گئے یہ بھی تمہارے لئے جائز نہ ہوگا کہ جبرا
عورتوں کے وارث بن جاؤ یہ بھی جائز نہیں کہ تم اُن عورتوں کو اپنے نکاح میں
لاؤ جو تمہارے باپوں کی بیویاں تھیں جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا، ایک وہ عورتیں

تم میں سے یا پہلے اہلِ کتاب میں سے تمہارے لئے حلال ہیں کہ ان سے
شادی کرو۔ لیکن جب مہر قرار پاکر نکاح ہو جائے بدکاری جائز نہیں اور نہ
چھپا ہوا یارانہ، عرب کے جاہلوں میں جس شخص کے اولاد نہ ہوتی تھی بعض میں یہ
رسم تھی کہ اُن کی بیوی اولاد کے لئے دوسرے سے آشنائی کرتی قرآنِ شریف
نے اس صورت کو حرام کر دیا۔ **مسافحت** اسی بدرسم کا نام ہے، پھر فرمایا۔
تم خودکشی نہ کرو، اپنی اولاد کو قتل نہ کرو، اور دوسرے گھروں میں وحشیوں کی
طرح خود بخود بے اجازت نہ چلے جاؤ اجازت لینا شرط ہے اور جب تم
دوسروں کے گھروں میں جاؤ تو داخل ہوتے ہی اَلسَّلامُ عَلَیکُم کہو۔ اور اگر
اُن گھروں میں کوئی نہ ہو تو جب تک کوئی مالک خانہ تمہیں اجازت نہ دے
اُن گھروں میں مت جاؤ اور اگر مالک خانہ یہ کہے کہ واپس چلے جاؤ تو تم واپس چلے جاؤ۔ اور
گھروں میں دیواروں پر سے کود کر نہ جایا کرو بلکہ گھروں میں اُن گھروں کے
دروازہ میں سے جاؤ اور اگر تمہیں کوئی سلام کہے تو اُس سے بہتر اور نیک تر
اُس کو سلام کہو، شراب اور قمار بازی اور بُت پرستی اور شگون لینا یہ سب پلید
اور شیطانی کام ہیں ان سے بچو، مردار مت کھاؤ۔ خنزیر کا گوشت مت کھاؤ۔
بُتوں کے چڑھاوے مت کھاؤ، لاٹھی سے مارا ہوا مت کھاؤ۔ گر کے
مرا ہوا مت کھاؤ، سینگ لگنے سے مرا ہوا مت کھاؤ۔ درندہ کا پھاڑا
ہوا مت کھاؤ۔ بُت پر چڑھایا ہوا مت کھاؤ۔ کیونکہ یہ سب مردار کا حکم رکھتے
ہیں اور اگر یہ لوگ پوچھیں کہ پھر کھائیں کیا؟ تو جواب یہ دے کہ دنیا
کی تمام پاک چیزیں کھاؤ۔ صرف مُردار اور مردار کے مشابہ اور پلید چیزیں

مت کھاؤ، اگر مجلس میں تمھیں کہا جائے کہ کشادہ ہو کر بیٹھو یعنی دوسروں کو
جگہ دو تو جلد جگہ کشادہ کر دو تاکہ دوسرے بیٹھیں اور اگر کہا جائے کہ
تم اُٹھ جاؤ تو بغیر چون و چرا کے اُٹھ جاؤ، گوشت، دال وغیرہ سب چیزیں
جو پاک ہوں بیشک کھاؤ مگر ایک .... طرف کی کثرت نہ کرو۔ اور
اسراف اور زیادہ خوری سے اپنے تئیں بچاؤ، لغو باتیں مت کیا کرو محل
اور موقع کی بات کیا کرو، اپنے کپڑے صاف رکھو، بدن اور گھر کو اور کوچہ
کو اور ہر جگہ کو جہاں تمھاری نشست ہو پلیدی اور میل کچیل اور کثافت
سے بچاؤ۔ یعنی غسل کرتے رہو اور گھروں کو صاف رکھنے کی عادت پکڑو
نہ بہت اونچا بولو نہ بہت نیچا درمیان کو نگاہ رکھو۔ یعنی باستثناء وقت
ضرورت کے، چلنے میں نہ بہت تیز چلو اور نہ بہت آہستہ درمیان کو نگاہ
رکھو، جب سفر کرو تو ہر طور پر سفر کا انتظام کر لیا کرو اور کافی زادِ راہ لے لیا
کرو۔ تاکہ گداگری سے بچو۔ جنابت کی حالت میں غسل کر لیا کرو۔ جب روٹی
کھاؤ تو سائل کو بھی دو اور کتے کو بھی ڈالو۔ اور دوسرے پرندہ کو بھی اگر موقع
ہو، یتیم لڑکیاں جن کی تم پرورش کرو اُن سے نکاح کرنا مضائقہ نہیں
لیکن اگر تم دیکھو کہ چونکہ وہ لاوارث ہیں شاید تمھارا نفس اُن پر زیادتی
کرے تو ماں باپ اور اقارب والی عورتیں کرو جو تمھاری مؤدب رہیں
اور اُن کا تمھیں خوف رہے۔ ایک۔ دو۔ تین۔ چار تک کر سکتے ہو بشرطیکہ
اعتدال کرو اور اگر اعتدال نہ ہو تو پھر ایک ہی پر کفایت کرو گو ضرورت
پیش آئے، چار کی حد جو لگائی گئی ہے وہ اس مصلحت سے ہے تاکہ

تم پرانی عادت کے تقاضہ سے افراط نہ کرو یعنی صد ہا تک نوبت نہ پہنچاؤ یا یہ کہ حرام کاری کی طرف جھک نہ جاؤ اور اپنی عورتوں کو مہر دو"۔

غرض یہ قرآن شریف کی پہلی اصلاح ہے جس میں انسان کی طبعی حالتوں کو وحشیانہ طریقوں سے کھینچ کر انسانیت کے لوازم اور تہذیب کی طرف توجہ دی گئی ہے اس تعلیم میں ابھی اعلیٰ اخلاق کا کچھ ذکر نہیں صرف انسانیت کے آداب ہیں، اور ہم لکھ چکے ہیں کہ اس تعلیم کی ضرورت اسلئے پیش آئی تھی کہ ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم جس قوم میں تشریف لائے تھے وہ لوگ وحشیانہ حالت میں سب قوموں سے بڑھے ہوئے تھے کسی پہلو میں انسانیت کا طریق اُن میں قائم نہیں رہا تھا۔ پس ضرور تھا کہ سب سے پہلے انسانیت کے ظاہری آداب اُن کو سکھائے جاتے۔

ایک نکتہ اس جگہ یاد رکھنے کے لائق ہے اور وہ نکتہ یہ ہے کہ خنزیر جو حرام کیا گیا ہے خدا نے ابتدا سے اس کے نام میں ہی حرمت کی طرف اشارہ کیا ہے، کیونکہ خنزیر کا لفظ خنز اور ار سے مرکب ہے جس کے یہ معنی ہیں کہ میں اس کو بہت فاسد اور خراب دیکھتا ہوں. خنز کے معنیٰ بہت فاسد اور ار کی معنی دیکھتا ہوں۔ پس اس جانور کا نام جو ابتدا سے خدائے تعالیٰ کی طرف سے اس کو ملا ہے وہی اسکی پلیدی پر دلالت کرتا ہے۔ اور عجیب اتفاق یہ ہے کہ ہندی میں اس جانور کو سؤر کہتے ہیں یہ لفظ بھی سو، اور ار سے مرکب ہے جس کے معنیٰ یہ ہیں کہ میں اس کو بہت بڑا دیکھتا ہوں، اس سے تعجب نہیں کرنا چاہیئے

کہ سور کا لفظ عربی کیونکر ہوسکتا ہے کیونکہ کتاب منن الرحمان میں
ثابت کیا گیا ہے کہ تمام زبانوں کی ماں عربی زبان ہے
اور عربی کے لفظ ہر زبان میں نہ ایک نہ دو بلکہ ہزاروں ملے ہوئے
ہیں سو سُور عربی لفظ ہے اسی لئے ہندی میں سُور کا ترجمہ بد
ہے۔ پس اس جانور کو بد بھی کہتے ہیں، اس میں کچھ بھی شک نہیں
معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں جبکہ تمام دنیا کی عربی زبان تھی اس
ملک میں یہ نام اس جانور کا عربی میں مشہور تھا جو خنزیر کے نام سے
ہم معنی ہے پھر اب تک یادگار باقی رہ گیا۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ شاستری
میں اس کے قریب قریب یہی لفظ متغیر ہو کر اور کچھ بن گیا ہو مگر صحیح
لفظ یہی ہے کیونکہ اپنی وجہ تسمیہ ساتھ رکھتا ہے جس پر لفظ خنزیر
گواہ ناطق ہے، اور یہ معنی جو اس کے لفظ سے ہیں یعنی بہت فاسد
اس کی تشریح کی حاجت نہیں اس بات کا کس کو علم نہیں کہ یہ جانور
اول درجہ کا نجاست خور اور نیز بے غیرت اور دیوث ہے اب اس کے
حرام ہونے کی وجہ ظاہر ہے کہ قانون قدرت یہی چاہتا ہے کہ ایسے
پلید بد جانور کے گوشت کا اثر بھی بدن اور روح پر پلید ہی ہو کیونکہ
ہم ثابت کر چکے ہیں کہ غذاؤں کا بھی انسان کی رُوح پر ضرور اثر ہے پس
اس میں کیا شک ہے کہ ایسے بد کا اثر بھی بد ہی پڑے گا۔ جیسا کہ
یونانی طبیبوں نے اسلام سے پہلے ہی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ
اس جانور کا گوشت بالخاصیت حیا کی قوت کو کم کرتا ہے اور دیوثی کو

ہوجاتا ہے۔ اور مُردار کا کھانا بھی اسی لئے اس شریعت میں منع ہے
کہ مُردار بھی کھانے والے کو اپنے رنگ میں لاتا ہے اور نیز ظاہری
صحت کے لئے بھی مضر ہے اور جن جانوروں کا خون اندر ہی رہتا
ہے جیسے گلا گھونٹا ہوا یا لاٹھی سے مارا ہوا یہ تمام جانور درحقیقت مردار
کے حکم میں ہی ہیں۔ کیا مُردہ کا خون اندر رہنے سے اپنی حالت پر
رہ سکتا ہے؟ نہیں! بلکہ وہ بوجہ مرطوب ہونے کے بہت جلد گندہ
ہوگا اور اپنی عفونت سے تمام گوشت کو خراب کرے گا اور نیز خون
کے کیڑے جو حال کی تحقیقات سے بھی ثابت ہوئے ہیں۔ مَر کر
ایک زہرناک عفونت بدن میں پھیلا دیں گے۔

قرآن شریف کی تعلیم فرمودہ دوسری اصلاح

یہ ہے کہ طبعی حالتوں کو شرائط مناسبہ کے ساتھ مشروط کر کے
اخلاق فاضلہ تک پہنچایا جائے سو واضح ہو کہ یہ حصہ بہت بڑا
ہے اگر ہم اس حصہ کو تفصیل کے ساتھ بیان کریں یعنی تمام وہ اخلاق
جو قرآن شریف نے بیان کئے ہیں تو یہ مضمون بہت طویل ہو جائیگا
اس لئے چند اخلاق فاضلہ نمونہ کے طور پر بیان کئے جاتے ہیں
اب جاننا چاہیے کہ اخلاق دو قسم کے ہیں۔
اوّل وہ اخلاق جن کے ذریعہ سے انسان ترکِ شر پر قادر

ہوتا ہے، اس مفہوم میں وہ اخلاق داخل ہیں جن کے ذریعہ سے انسان کوشش کرتا ہے کہ اپنی زبان یا اپنے ہاتھ یا اپنی آنکھ یا اپنے کسی اور عضو سے دوسرے کے مال یا عزت یا جان کو نقصان نہ پہنچا سکے یا نقصان رسانی اور کسرِ شان کا ارادہ نہ کرسکے۔"

دوسرے وہ اخلاق جن کے ذریعہ سے انسان ایصالِ خیر پر قادر ہوتا ہے، اس مفہوم میں وہ تمام اخلاق داخل ہیں جن کے ذریعہ سے انسان کوشش کرتا ہے کہ اپنی زبان یا اپنے ہاتھ یا اپنے مال یا اپنے علم یا کسی اور ذریعہ سے دوسرے کے مال یا عزت کو فائدہ پہنچا سکے یا اس کے جلال یا عزت ظاہر کرنے کا ارادہ کرسکے یا اگر کسی نے اس پر کوئی ظلم کیا تھا تو جس سزا کا وہ ظالم مستحق تھا اس سے درگزر کرسکے اور اس طرح اس کو دکھ اور عذاب بدنی و تاوان مالی سے محفوظ رہنے کا فائدہ پہنچا سکے یا اس کو ایسی سزا دے سکے جو حقیقت میں اس کے لئے سراسر رحمت ہے۔

"ترکِ شر"

واضح ہو کہ وہ اخلاق جو ترکِ شر کے لئے صانعِ حقیقی نے مقرر فرمائے ہیں وہ عربی زبان میں جو تمام انسانی خیالات اور اوضاع اور اخلاق کے اظہار کے لئے ایک ایک مفرد لفظ اپنے اندر رکھتی ہے چار ناموں سے موسوم ہیں (۱) اِحصَان یا عِفّت (۲) امانت

و دیانت (۳) ھُدٰی نَفۡۡ و ھُدٰون (۴) رفق و قول حسن۔

(۱) پہلا خلق۔ اِحصان کے نام سے موسوم ہے اور اس لفظ سے مراد خاص وہ پاکدامنی ہے جو مرد اور عورت کی قوت تناسل سے علاقہ رکھتی ہے اور محصن یا محصنہ اس مرد یا عورت کو کہا جائیگا جو حرام کاری یا اس کے مقدمات سے مجتنب رہ کر اس ناپاک بدکاری سے اپنے تئیں رُوکے جس کا نتیجہ دونوں کے لئے اس عالم میں ذلت اور لعنت اور دوسرے جہاں میں عذاب آخرت اور متعلقین کے لئے علاوہ بے آبروئی کے نقصان شدید ہے مثلاً جو شخص کسی کی بیوی سے اس ناجائز حرکت کا مرتکب ہو یا مثلاً زنا تو نہیں مگر اس کے مقدمات مرد اور عورت دونوں سے ظہور میں آئیں تو کچھ شک نہیں کہ اس غیرت مند مظلوم کو ایسی بیوی کو جو زنا کرانے پر راضی ہو گئی تھی یا زنا بھی واقع ہو چکا تھا طلاق دینی پڑے گی، اور بچوں پر بھی اگر اس عورت کے پیٹ سے ہوں گے بڑا تفرقہ پڑے گا اور مالکِ خانہ یہ تمام نقصان اُس بدذات کی وجہ سے اٹھائیگا۔

اس جگہ یاد رہے کہ یہ خلق جس کا نام احصان یا عفت ہے یعنی پاک دامنی یہ اُسی حالت میں خلق کہلائے گا جب کو ایسا شخص جو بدکاری یا بدنظری کی استعداد اپنے اندر رکھتا ہے یعنی قدرت نے وہ قویٰ اُس کو دے رکھے ہیں جن کے ذریعہ سے اس جرم کا مرتکب ہو سکتا ہے، اس فعل شنیع سے اپنے تئیں بچائے، اور اگر بباعث بچہ

یا نامرد ہونے یا خوجہ ہونے یا پیر فرتوت ہونے کے یہ قوت اِس
میں موجود نہ ہو تو اس صورت میں ہم اِس کو اس خُلق سے جس کا
نام اِحصان یا عِفّت ہے موسوم نہیں کر سکتے ہاں یہ ضرور ہے کہ
عفّت اور احصان کی اُس میں ایک طبعی حالت ہے مگر ہم بار بار
لکھ چکے ہیں کہ طبعی حالتیں اس کے نام سے موسوم نہیں ہو سکتیں
بلکہ اس وقت خُلق کے مد میں داخل کیجائیں گی جب عقل کے زیر سایہ
ہو کر اپنے محل پر صادر ہوں یا صادر ہونے کی قابلیت پیدا کر لیں
لہٰذا جیسا کہ میں لکھ چکا ہوں کہ بچے اور نامرد اور ایسے لوگ جو کسی
تدبیر سے اپنے تئیں نامرد کر لیتے اس خُلق کا مصداق نہیں ٹھہر سکتے۔
گو بظاہر عفّت اور احصان کے رنگ میں اپنی عمر بسر کریں بلکہ ان
تمام صورتوں میں اُن کی عفت اور احصان کا نام طبعی حالت ہوگا۔
اور سمجھو، اور چونکہ یہ ناپاک حرکت اور اُس کے مقدمات جیسے مرد سے
صادر ہو سکتے ہیں ویسے ہی عورت سے بھی صادر ہو سکتے ہیں لہٰذا
خدا کی پاک کتاب میں دونوں "مرد اور عورت" کیلئے یہ تعلیم قرآنی لکھی
ہے۔ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَيَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى
لَهُمْ۔ وَقُلْ لِّلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ
وَيَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ زِيْنَتَهُنَّ اِلَّا مَا ظَهَرَ
مِنْهَا وَلْيَضْرِبْنَ بِخُمُرِهِنَّ عَلٰى جُيُوْبِهِنَّ وَلَا يُبْدِيْنَ

بِاَرْجُلِهِنَّ لِيُعْلَمَ مَا يُخْفِيْنَ مِنْ زِيْنَتِهِنَّ وَتُوْبُوْا اِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا اَيُّهَ الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ

وَلَا تَقْرَبُوا الزِّنَا اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّسَاءَ سَبِيْلًا ۝ وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا ۝ وَرَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ ۝ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۝

یعنی ایمانداروں کو جو مرد ہیں کہدے کہ آنکھوں کو نامحرم عورتوں کے دیکھنے سے بچائے رکھیں اور ایسی عورتوں کو کھلے طور سے نہ دیکھیں جو شہوت کا محل ہو سکتی ہوں اور ایسے موقعوں پر خوابیدہ نگاہ کی عادت پکڑیں اور اپنے ستر کی جگہ کو جس طرح ممکن ہو بچائیں۔ ایسا ہی کانوں کو نامحرموں سے بچائیں یعنی بیگانہ عورتوں کے گانے بجانے اور خوش الحانی کی آوازیں نہ سنیں اُن کے حسن کے قصے نہ سنیں یہ طریق پاک نظر اور پاک دل رہنے کے لئے عمدہ طریق ہے ایسا ہی ایماندار عورتوں کو کہہ دے کہ وہ بھی اپنی آنکھوں کو نامحرم مردوں کے دیکھنے سے بچائیں اور اپنے کانوں کو بھی نامحرموں سے بچائیں، یعنی اُن کی پُرشہوت آوازیں نہ سنیں اور اپنے ستر کی جگہوں کو پردہ میں رکھیں اور اپنے زینت کے اعضا کو کسی غیر محرم پر نہ کھولیں اور اپنی اوڑھنی کو اس طرح سر پر لیں کہ گریبان سے ہو کر سر پر آجائے اور دونوں کان اور سر

اور کنپٹیاں سب چادر کے پردے میں رہیں اور اپنے پیروں کو
زمین پر ناچنے والوں کی طرح نہ ماریں یہ وہ تدبیر ہے جس کی پابندی
ٹھوکر سے بچا سکتی ہے اور دوسرا طریق بچنے کے لئے یہ ہے کہ خدا تعالےٰ
کی طرف رجوع کریں اور اس سے دعا کریں تاکہ وہ ٹھوکر سے بچائے
اور لغزشوں سے نجات دے، "زنا کے قریب مت جاؤ یعنی ایسی
تقریبوں سے دور رہو جن سے یہ خیال بھی دل میں پیدا ہو سکتا ہو اور ان
راہوں کو اختیار نہ کرو جن سے اس گناہ کے وقوع کا اندیشہ ہو۔ جو
زنا کرتا ہے وہ بدی کو انتہا تک پہنچا تا ہے زنا کی راہ بہت بُری
راہ ہے یعنی منزل مقصود سے روکتی ہے اور تمہاری آخری منزل
کے لئے سخت خطرناک ہے اور جس کو نکاح میسر نہ آئے چاہیئے کہ
وہ اپنی عفت کو دوسرے طریقوں سے بچائے مثلاً روزہ رکھے یا
کم کھائے یا اپنی طاقتوں سے تن آزار کام لے اور لوگوں نے بھی یہ
طریق نکالے ہیں کہ وہ ہمیشہ عمداً نکاح سے دست بردار رہیں۔ یا
خوجے بنیں یا اور کسی طریق سے رہبانیت اختیار کریں۔ مگر ہم
نے انسان پر یہ حکم فرض نہیں کئے اسی لئے وہ ان بدعتوں کو پوری
طرح نباہ نہ سکے، خدا کا یہ فرمانا کہ ہمارا یہ حکم نہیں کہ لوگ خوجے بنیں
یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اگر خدا کا حکم ہوتا تو سب لوگ
اس حکم پر عمل کرنے کے مجاز نہ تھے تو اس صورت میں بنی آدم کی
قطع نسل ہو کر کبھی کا دنیا کا خاتمہ ہو جاتا، اور نیز اگر اس طرح پر

عفت حاصل کرنا تھا کہ عضو مردمی کو کاٹ دیں تو یہ در پردہ اس صانع پر اعتراض ہے جس نے وہ عضو بنایا اور نیز چونکہ ثواب کا تمام مدار اس بات میں ہے کہ ایک قوت موجود ہو اور پھر انسان خدائے تعالیٰ کا خوف کر کے اس قوت کے خراب جذبات کا مقابلہ کرتا ہے اور اس کے منافع سے فائدہ اٹھا کر دو طور کا ثواب حاصل کرے پس ظاہر ہے کہ ایسے عضو کے ضائع کر دینے میں دونوں ثوابوں سے محروم رہا۔ ثواب تو جذبۂ مخالفانہ کے وجود اور پھر اس کے مقابلہ سے ملتا ہے مگر جس میں بچہ کی طرح وہ قوت ہی نہیں رہی اس کو کیا ثواب ملیگا۔ کیا بچہ کو اپنی عفت کا ثواب مل سکتا ہے؟

ان آیات میں خدا تعالیٰ نے خُلقِ احصان یعنی عفت کے حاصل کرنے کے لئے صرف اعلیٰ تعلیم ہی نہیں فرمائی بلکہ اپنے تئیں پاک دامن رکھنے کے لئے پانچ علاج بھی بتا دیئے ہیں یعنی (۱) اپنی آنکھوں کو نامحرم پر نظر ڈالنے سے بچانا (۲) کانوں کو نامحرموں کی آواز سننے سے بچانا، (۳) نامحرموں کے قصے نہ سننا (۴) تمام تقریبوں سے جن میں اس بد فعل کا اندیشہ ہے اپنے تئیں بچانا، (۵) اگر نکاح نہ ہو تو روزہ رکھنا وغیرہ۔

اس جگہ بڑے دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ اعلیٰ تعلیم ان سب تدبیروں کے ساتھ جو قرآن شریف نے بیان فرمائی ہیں صرف اسلام سے ہی خاص ہے اور اس جگہ ایک نکتہ یاد رکھنے کے

لائق ہے کہ چونکہ انسان کی وہ طبعی حالت جو شہوات کا منبع ہے۔ جس سے انسان بغیر کسی کامل تغیر کے الگ نہیں ہو سکتا یہی ہے کہ اس کے جذبات شہوت محل اور موقع پاکر جوش مارنے سے رہ نہیں سکتے یا یوں کہو کہ سخت خطرہ میں پڑ جاتے ہیں اس لئے خدا تعالیٰ نے ہمیں یہ تعلیم نہیں دی کہ ہم نامحرم عورتوں کو بلا تکلف دیکھ تو لیا کریں اور ان کی تمام زینتوں پر نظر ڈال لیں اور ان کے تمام انداز ناچنا وغیرہ مشاہدہ کرلیں۔ لیکن پاک نظر سے دیکھیں اور نہ یہ تعلیم ہمیں دی ہے کہ ہم ان بیگانہ جوان عورتوں کا گانا بجانا سن لیں۔ اور ان کے حسن کے قصے بھی سنا کریں مگر پاک خیال سے سنیں، بلکہ ہمیں تاکید ہے کہ ہم نامحرم عورتوں کو اور ان کی زینت کی جگہ کو ہرگز نہ دیکھیں، نہ پاک نظر سے اور نہ ناپاک نظر سے، اور ان کی خوش الحانی کی آوازیں اور ان کے حسن و جمال کے قصے نہ سنیں نہ پاک خیال سے اور نہ ناپاک خیال سے، بلکہ ہمیں چاہیئے کہ ان کے دیکھنے اور سننے سے نفرت رکھیں جیسا کہ مردار سے تاکہ ٹھوکر نہ کھائیں۔ کیونکہ ضرور ہے کہ بے قیدی کی نظروں سے کسی وقت ٹھوکریں پیش آئیں سو چونکہ خدائے تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہماری آنکھیں اور ہمارے دل اور ہمارے خطرات سب پاک رہیں۔ اس لئے اس نے یہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم فرمائی۔ اس میں کیا شک ہے کہ بے قیدی ٹھوکر کا موجب ہوتی ہے۔ اگر ہم ایک بھوکے کتے کے آگے نرم نرم روٹیاں

رکھ دیں اور پھر امید رکھیں کہ اس کتے کے دل میں خیال تک اُن روٹیوں کا نہ آئے تو ہم اپنے اس خیال میں غلطی پر ہیں۔ سو خدای تعالیٰ نے چاہا کہ نفسانی قویٰ کو پوشیدہ کارروائیوں کا موقع بھی نہ ملے اور ایسی کوئی بھی تقریب پیش نہ آئے جس سے بدخطرات جنبش کر سکیں۔

اسلامی پردہ کی یہی فلاسفی اور یہی ہدایت شرعی ہے خدا کی پاک کتاب میں پردہ سے یہ مُراد نہیں کہ فقط عورتوں کو قیدیوں کی طرح حراست میں رکھا جائے یہ اُن نادانوں کا خیال ہے جنکو اسلامی طریقوں کی خبر نہیں، بلکہ مقصود یہ ہے کہ عورت و مرد دونوں کو آزاد نظراندازی اور اپنی زینتوں کے دکھانے سے روکا جائے کیونکہ اس میں عورت و مرد دونوں کی بھلائی ہے ماالآخر یہ بھی یاد رہے کہ خوابیدہ آنکھ سے غیر محل پر نظر ڈالنے سے اپنے تئیں بچا لینا اور دوسری جائز النظر چیزوں کو دیکھنا اس طریق کو عربی میں غضِ بصر کہتے ہیں اور ہر ایک پرہیزگار جو اپنے دل کو پاک رکھنا چاہتا ہے اس کو نہیں چاہیئے کہ حیوانوں کی طرح جس طرف چاہے بے محابا نظر اٹھا کر دیکھ لیا کرے بلکہ اُس کے لئے اس تمدنی زندگی میں غضِ بصر کی عادت ڈالنا ضروری ہے اور یہ وہ مبارک عادت ہے جس سے اس کی یہ طبعی حالت ایک بھاری خُلق کے رنگ میں آ جائے گی۔ اور اس کی تمدنی ضرورت میں بھی فرق نہیں پڑے گا۔ یہی وہ خُلق ہے

جس کو اِحصان یا عِفّت کہتے ہیں۔

(۲) دوسرا خلق - امانت و دیانت یعنی دوسرے کے مال پر شرارت اور بدنیتی سے قبضہ کر کے اس کو ایذا پہنچانے پر راضی نہ ہونا۔" سو واضح ہو کہ دیانت اور امانت انسان کی طبعی حالتوں میں سے ایک حالت ہے اسی واسطے ایک بچہ شیرخوار بھی جو بوجہ کم سنی اپنی طبعی سادگی پر ہوتا ہے اور نیز بباعث صغر سنی ابھی بُری عادتوں کا عادی نہیں ہوتا غیر کی چیز سے اس قدر نفرت رکھتا ہے کہ غیر عورت کا دودھ بھی مشکل سے پیتا ہے اور اگر بیہوشی کے زمانہ میں کوئی اور دایہ مقرر نہ ہو تو ہوش کے زمانہ میں اس کو دوسری کا دودھ پلانا نہایت مشکل ہو جاتا ہے اور اپنی جان پر بہت تکلیف اُٹھاتا ہے اور ممکن ہے کہ اس تکلیف سے مرنے کے قریب ہو جائے مگر دوسری عورت کے دودھ سے طبعاً بیزار ہوتا ہے، اس قدر نفرت کا کیا بھید ہے؟ بس یہی کہ وہ والدہ کو چھوڑ کر غیر کی چیز کی طرف رجوع کرنے سے طبعاً متنفر ہے، اب ہم ایک گہری نظر سے بچہ کی اس عادت کو دیکھتے اور اُس پر غور کرتے ہیں اور فکر کرتے کرتے اس کی اس عادت کی تہ تک چلے جاتے ہیں تو ہم پر صاف کھل جاتا ہے۔ کہ یہ عادت جو غیر کی چیز سے اس قدر نفرت کرنا کہ اپنے اوپر مصیبت ڈال لینا، یہی ہے تخم دیانت اور امانت کی، اور دیانت کی خُلق میں کوئی شخص راستباز نہیں ٹھہر سکتا۔ جب تک بچہ کی طرح

غیر کی مال کے بارے میں بھی سچی نفرت اور کراہت اس کے دل میں پیدا نہ ہو جائے، لیکن بچہ اس عادت کو اپنے محل پر استعمال نہیں کرتا اور اپنی بیوقوفی کے سبب سے بہت کچھ تکلیفیں اٹھا لیتا ہے لہذا اس کی یہ عادت صرف ایک طبعی حالت ہے جس کو وہ بے اختیار ظاہر کرتا ہے اس لئے یہ حرکت خُلق میں داخل نہیں ہو سکتی گو انسانی سرشت میں اصل جڑ خلق دیانت و امانت کی یہی ہے، جیسا کہ بچہ اس غیر معقول حرکت سے متدین اور امین نہیں کہلا سکتا ایسا ہی وہ شخص بھی اس خلق سے متصف نہیں ہو سکتا۔ جو اس طبعی حالت کو محل پر استعمال نہیں کرتا، امین اور دیانت دار بننا بہت نازک امر ہے۔ جب تک انسان اس کے تمام پہلو بجا نہ لائے امین اور دیانت دار نہیں ہو سکتا اس میں اللہ تعالیٰ نے نمونہ کے طور پر آیات مفصلہ ذیل میں امانت کا طریق سمجھایا ہے اور وہ امانت کا طریق یہ ہے:۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَآءَ اَمْوَالَكُمُ الَّتِىْ جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ قِيٰمًا وَّارْزُقُوْهُمْ فِيْهَا وَاكْسُوْهُمْ وَقُوْلُوْا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا۔ وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَاْكُلُوْهَاۤ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ج وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا وَلْيَخْشَ الَّذِيْنَ

لَوْ تَرَكُوْا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعٰفًا خَافُوْا عَلَيْهِمْ فَلْيَتَّقُوا اللّٰهَ وَلْيَقُوْلُوْا قَوْلًا سَدِيْدًا ۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّمَا يَاْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيْرًا ۔

یعنی اگر کوئی ایسا تم میں مالدار ہو جو صحیح العقل نہ ہو مثلاً یتیم یا نابالغ ہو اور اندیشہ ہو کہ وہ اپنی حماقت سے اپنے مال کو ضائع کر دیگا تو تم (بطور کورٹ آف وارڈس کے) وہ تمام مال اس کا متکفل کے طور پر اپنے قبضہ میں لے لو اور وہ تمام مال جس پر سلسلۂ تجارت اور معیشت کا چلتا ہے۔ ان بیوقوفوں کے حوالہ مت کرو اور راس المال میں سے بقدرِ ضرورت اُن کے کھانے اور پہننے کے لئے دیدیا کرو اور انکو اچھی باتیں قول معروف کی کہتے رہو یعنی ایسی باتیں جن سے اُنکی عقل اور تمیز بڑھے۔ اور ایک طور سے اُن کے مناسب حال اُن کی تربیت ہو جائے اور جاہل اور ناتجربہ کار نہ رہیں اگر وہ تاجر کے بیٹے ہیں تو تجارت کے طریقے اُن کو سکھاؤ اور اگر کوئی اور پیشہ رکھتے ہوں تو اُس پیشہ کے مناسب حال اُن کو پختہ کر دو غرض ساتھ ساتھ اُن کو تعلیم دیتے جاؤ اور اپنی تعلیم کا وقتاً فوقتاً امتحان بھی کرتے رہو کہ جو کچھ تم نے سکھایا ہے اُنھوں نے سمجھا بھی ہے یا نہیں، پھر جب نکاح کے لائق ہو جائیں یعنی عمر قریباً اٹھارہ برس تک پہنچ جائے اور تم دیکھو کہ اُن میں اپنے مال کے انتظام کی عقل پیدا ہو گئی ہے تو اُن کا مال اُن کے حوالہ کرو، اور فضول خرچی کے طور پر

اُن کا مال خرچ نہ کرو اور نہ اس خوف سے جلدی کر کے کہ یہ اگر بڑھ جائیں گے تو اپنا مال لے لیں گے اُن کے مال کا نقصان کرو، جو شخص دولت مند ہو اُس کو نہیں چاہئیے کہ اُن کے مال میں سے کچھ حق الخدمت لے۔ لیکن ایک محتاج بطور معروف لے سکتا ہے عرب میں مالی محافظوں کے لئے یہ طور معروف تھا کہ اگر یتیموں کے کار پرداز اُن کے مال میں سے لینا چاہتے تو حتی الوسع یہ قاعدہ جاری رکھتے کہ جو کچھ یتیم کے مال کو تجارت سے فائدہ ہو اُس میں سے آپ بھی لیتے راس المال کو تباہ نہ کرتے، سو یہ اسی عادت کی طرف اشارا ہے کہ تم بھی ایسا کرو، اور پھر فرمایا کہ جب تم یتیموں کو مال واپس کرنے لگو تو گواہوں کے رُو برو اُن کو اُن کا مال دو اور جو شخص فوت ہونے لگے اور بچے اُس کے ضعیف اور صغیر السن ہوں تو اُس کو نہیں چاہئے کہ کوئی ایسی وصیت کرے کہ جس میں بچوں کی حق تلفی ہو، جو لوگ ایسے طور سے یتیم کا مال کھاتے ہیں جس سے یتیم پر ظلم ہو جائے وہ مال نہیں کھاتے بلکہ آگ کھاتے ہیں اور آخر جلانے والی آگ میں ڈالے جائیں گے" اب دیکھو کہ خدا تعالی نے دیانت اور امانت کے کس قدر پہلو بتائے سو حقیقی دیانت اور امانت یہی ہے کہ ان تمام پہلوؤں کے لحاظ سے ہو اور اگر پوری عقلمندی کو دخل دیکر امانت داری میں تمام پہلوؤں کا لحاظ نہ ہو تو ایسی دیانت اور امانت کئی طور سے چھپی ہوئی خیانتیں اپنے

ہمراہ رکھے گی، اور پھر دوسری جگہ فرمایا کہ وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ
بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ
بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ
اِلٰٓى اَهْلِهَا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَآئِنِيْنَ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا
كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۝ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ
اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ وَلَا تَتَبَدَّلُوا
الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ۔ یعنی ایک دوسرے کے مال کو ناجائز طور پر
مت کھایا کرو اور نہ اپنے مال کو رشوت کے طور پر حکام تک پہنچایا
کرو تاکہ اس طرح پر حکام کی اعانت سے دوسرے کے مالوں کو
دبالو، امانتوں کو ان کے حقداروں کو واپس دے دیا کرو، خدا
خیانت کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا جب تم ناپو تو پورا ناپو ،
جب تم وزن کرو تو پوری اور بے خلل ترازو سے وزن کرو، اور
کسی طرح سے لوگوں کو ان کے مال کا نقصان نہ پہنچاؤ اور فساد کی
نیت سے زمین پر مت پھرا کرو یعنی اس نیت سے کہ چوری کریں یا
ڈاکہ ماریں یا کسی کی جیب کتریں۔ یا کسی اور ناجائز طریق سے بیگانہ
مال پر قبضہ کریں۔ اور پھر فرمایا کہ تم اچھی چیزوں کے عوض میں خبیث
اور ردی چیزیں نہ دیا کرو یعنی جس طرح دوسروں کا مال دبا لینا ناجائز ہے
اسی طرح خراب چیزیں بیچنا یا اچھی چیز کے عوض بری چیز دینا بھی
ناجائز ہے۔" ان تمام آیات میں خدائے تعالیٰ نے تمام طریقے
بددیانتی کے بیان فرما دیے اور ایسے کاموں کو [illegible]

صرف یہ نہیں کہا کہ تو چوری نہ کرنا۔ ایک نادان یہ نہ سمجھ لے کہ چوری تو میرے لئے حرام ہے مگر دوسرے ناجائز طریقے سب حلال ہیں۔ اس کلمۂ جامعہ کے ساتھ تمام ناجائز طریقوں کو حرام ٹھہرانا یہی حکمت بیانی ہے۔ غرض اگر کوئی اس بصیرت سے دیانت اور امانت کا خلق اپنے اندر نہیں رکھتا اور ایسے تمام پہلوؤں کی رعایت نہیں کرتا وہ اگر دیانت و امانت کو بعض امور میں دکھائے بھی تو یہ حرکت اس کی خلق دیانت میں داخل نہیں سمجھی جائے گی بلکہ ایک طبعی حالت ہو گی جو عقل تمیز اور بصیرت سے خالی ہے۔

(۳) تیسرا خلق۔ **ھُدنہ** اور **ھَون** یعنی دوسرے کو ظلم کی راہ سے بدنی آزار نہ پہنچانا۔ اور بے شر انسان ہونا اور صلحکاری کے ساتھ زندگی بسر کرنا۔ پس بلاشبہ یہ ایک اعلیٰ درجہ کا خلق ہے اور انسانیت کے لئے ازبس ضروری، اور اس خلق کے مناسب حال طبعی قوت جو بچہ میں ہوتی ہے جس کی تعدیل سے یہ خلق بنتا ہے۔ **اُلفت** ہے یعنی خوگرفتگی۔ یہ تو ظاہر ہے کہ انسان صرف اپنی طبعی حالت میں یعنی اس حالت میں کہ جب انسان عقل سے بے بہرہ ہو صلح کے مضمون کو سمجھ نہیں سکتا اور نہ جنگ جوئی کے مفہوم کو سمجھ سکتا ہے پس اس وقت جو ایک عادت موافقت کی اس میں پائی جاتی ہے وہی صلح کاری کی عادت کی ایک جڑ ہے لیکن چونکہ وہ عقل اور تدبر اور خاص ارادہ سے اختیار نہیں کی جاتی اس لئے

خلق میں داخل نہیں بلکہ خلق میں تب داخل ہوگی جب انسان بالارادہ اپنے تئیں بے شر بنا کر صلحکاری کے خلق کو اپنے محل پر استعمال کرے اور بے محل استعمال کرنے سے مجتنب رہے۔ اللہ جل شانہٗ تعلیم فرماتا ہے وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ اَلصُّلْحُ خَيْرٌ ط وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا ــ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ۔ یعنی آپس میں صلحکاری اختیار کرو، صلح میں خیر ہے، جب وہ صلح کی طرف جھکیں تم بھی جھک جاؤ، خدا کے نیک بندے صلحکاری کے ساتھ زمین پر چلتے ہیں اور اگر کوئی لغویات کسی سے سنیں جو جنگ کا مقدمہ اور لڑائی کی ایک تمہید ہو تو بزرگانہ طور پر طرح دیکر چلے جاتے ہیں اور ادنیٰ ادنیٰ بات پر لڑنا شروع نہیں کر دیتے، یعنی جب تک کوئی زیادہ تکلیف نہ پہنچے اس وقت تک ہنگامہ پردازی کو اچھا نہیں سمجھتے اور صلحکاری کے محل شناسی کا یہی اصول ہے کہ ادنیٰ ادنیٰ باتوں کو خیال میں نہ لائیں اور معاف فرمائیں، اور لغو کا لفظ جو اس آیت میں آیا ہے سو واضح ہو کہ عربی زبان میں لغو اس حرکت کو کہتے ہیں کہ مثلاً ایک شخص شرارت سے ایسی بکواس کرے یا بہ نیت ایذا رسانی ایسا فعل اس سے صادر ہو کہ دراصل اس سے کچھ ایسا حرج اور نقصان نہیں پہنچتا سو صلحکاری کی یہ علامت ہے

کہ ایسی بیہودہ ایذا سے چشم پوشی فرمائیں اور بزرگانہ سیرت عمل میں لائیں لیکن اگر ایذا صرف لغو کی مد میں داخل نہ ہو بلکہ اس سے واقعی طور پر جان یا مال یا عزت کو ضرر پہنچے تو صلح کاری کے خلق کو اس سے کچھ تعلق نہیں بلکہ اگر ایسے گناہ کو بخشا جائے تو اس خلق کا نام عفو ہے جس کا انشاء اللہ تعالیٰ اس کے بعد بیان ہوگا۔ اور پھر فرمایا کہ جو شخص شرارت سے کچھ یاوہ گوئی کرے تو تم نیک طریق سے صلحکاری کا اس کو جواب دو۔ تب اس خصلت سے دشمن بھی دوست ہو جائیگا۔ غرض صلحکاری کے طریق سے چشم پوشی کا محل صرف اس درجہ کی بدی ہے جس سے کوئی واقعی نقصان نہ پہنچا ہو۔ صرف دشمن کی بیہودہ گوئی ہو۔

۴ چوتھا خلق۔ رفق اور قول حسن ہے، یہ خلق جس طبعی حالت سے پیدا ہوتا ہے اس کا نام طلاقت یعنی کشادہ روئی ہے۔ بچہ جب تک کلام کرنے پر قادر نہیں ہوتا بجائے رفق اور قول حسن کے طلاقت دکھاتا ہے یہی دلیل اس بات پر ہے کہ رفق کی جڑ جہاں سے یہ شاخ پیدا ہوتی ہے طلاقت ہے، طلاقت ایک قوت ہے اور رفق ایک خلق ہے جو اس قوت کو محل پر استعمال کرنے سے پیدا ہوجاتا ہے، اس میں خدا تعالیٰ کی یہ تعلیم ہے۔

وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا۔ لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ

خَیْرًا مِّنْھُنَّ وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَکُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ
اِجْتَنِبُوْا کَثِیْرًا مِّنَ الظَّنِّ ز اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا
وَلَا یَغْتَبْ بَّعْضُکُمْ بَعْضًا ط وَاتَّقُوا اللّٰہَ اِنَّ اللّٰہَ تَوَّابٌ
رَّحِیْمٌ ۔ وَلَا تَقْفُ مَا لَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ ط اِنَّ السَّمْعَ
وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْئُوْلًا ط

ترجمہ۔ یعنی لوگوں کو کہو وہ باتیں کہو جو واقعی طور پر نیک ہوں، ایک قوم دوسری قوم سے ٹھٹھا نہ کرے ہو سکتا ہے کہ جن سے ٹھٹھا کیا گیا ہے وہی اچھے ہوں بعض عورتیں بعض عورتوں سے ٹھٹھا نہ کریں۔ ہو سکتا ہے کہ جن سے ٹھٹھا کیا گیا ہے وہی اچھی ہوں، اور عیب مت لگاؤ ان لوگوں کے بُرے بُرے نام مت رکھو، بدگمانی کی باتیں مت کرو، اور نہ عیبوں کو کُرید کُرید کر پوچھو، ایک دوسرے کا گلہ مت کرو، کسی کی نسبت وہ الزام نہ لگاؤ جس کا تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں، اور یاد رکھو کہ ہر عضو سے مواخذہ ہوگا اور کان۔ آنکھ۔ دل۔ ہر ایک سے پوچھا جائے گا۔

ایصالِ خیر

ایصالِ خیر کے اخلاق بھی چار ناموں سے موسوم ہیں (۱) عفو (۲) عدل (۳) احسان (۴) اِیْتَاءِ ذِی الْقُرْبٰی

(۱) پہلا خلق۔ عفو ہے یعنی کسی کے گناہ کو بخشدینا، اسمیں ایصالِ خیر یہ ہے کہ جو گناہ کرتا ہے وہ ایک ضرر پہنچاتا ہے اور اس لائق ہوتا ہے کہ اُس کو بھی ضرر پہنچایا جائے۔ سزا دلائی جائے قید کرایا جائے۔ جرمانہ کرایا جائے، یا آپ ہی اس پر ہاتھ اٹھایا جائے پس اُس کو بخشدینا اگر بخشدینا مناسب ہو اُس کے حق میں ایصالِ خیر ہے" اس میں قرآن شریف کی تعلیم یہ ہے کہ وَالْکَاظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ۔ جَزٰٓؤُا سَیِّئَۃٍ سَیِّئَۃٌ مِّثْلُھَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُہٗ عَلَی اللّٰہِ۔ یعنی نیک آدمی وہ ہیں جو غصہ کھانے کے محل پر اپنا غصہ کھا جاتے ہیں اور بخشنے کے محل پر گناہ کو بخشتے ہیں، بدی کی جزا اُسی قدر بدی ہے جو کی گئی ہو لیکن جو شخص گناہ کو بخشدے اور ایسے موقع پر بخشے کہ اُس سے کوئی اصلاح ہوتی ہو کوئی شر پیدا نہ ہوتا ہو یعنی عین عفو کے محل پر ہو نہ غیر محل پر تو اُس کا وہ بدلہ پائے گا۔" اس آیت سے ظاہر ہے کہ قرآنی تعلیم یہ نہیں کہ خواہ نخواہ اور ہر جگہ شر کا مقابلہ نہ کیا جائے اور شریروں و ظالموں کو سزا نہ دی جائے بلکہ یہ تعلیم ہے کہ دیکھنا چاہیئے کہ وہ محل اور موقع گناہ بخشنے کا ہے یا سزا دینے کا ہے، پس مجرم کے حق میں اور نیز عامہ خلائق کے حق میں جو کچھ فی الواقع بہتر ہو وہی صورت اختیار کی جائے، بعض وقت ایک مجرم گناہ بخشنے سے توبہ کرتا ہے، اور بعض وقت ایک مجرم گناہ بخشنے سے اور بھی دلیر ہو جاتا ہے، پس خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ اندھوں کی طرح صرف گناہ

بخشنے کی عادت مت ڈالو۔ بلکہ غور سے دیکھ لیا کرو کہ حقیقی نیکی کس بات میں ہے! آیا بخشنے میں یا سزا دینے میں، پس جو امر محل اور موقع کے مناسب ہو وہی کرو۔"

افراد انسانی کے دیکھنے سے صاف ظاہر ہے کہ جیسے بعض لوگ کینہ کشی پر بہت حریص ہوتے ہیں یہاں تک کہ دادوں پر دادوں کے کینوں کو یاد رکھتے ہیں۔ ایسا ہی بعض لوگ عفو اور درگذر کی عادت کو انتہا تک پہنچا دیتے ہیں اور بسا اوقات اس عادت کے افراط سے دیوثی تک نوبت پہنچ جاتی ہے اور ایسے قابلِ شرم حلم اور عفو اور درگذر اُن سے صادر ہوتے ہیں جو سراسر حمیت اور غیرت اور عفت کے برخلاف ہیں بلکہ نیک چلنی پر داغ لگاتے ہیں اور ایسے عفو اور درگذر کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سب لوگ توبہ توبہ کر اُٹھتے ہیں۔ اِن ہی خرابیوں کے لحاظ سے قرآن شریف میں ہر خلق کے لئے محل اور موقع کی شرط لگا دی گئی ہے اور ایسے خلق کو منظور نہیں رکھا جو بے محل صادر ہو" یاد رہے کہ مجرد عفو کو خلق نہیں کہہ سکتے بلکہ وہ ایک طبعی قوت ہے جو بچوں میں بھی پائی جاتی ہے بچہ کو جس کے ہاتھ سے چوٹ لگ جائے خواہ شرارت ہی سے لگے تھوڑی دیر کے بعد اس قصے کو بھلا دیتا ہے اور پھر اُس کے پاس محبت سے جاتا ہے، اور اگر ایسے شخص نے اُس کے قتل کا ارادہ بھی کیا ہو تب بھی صرف میٹھی بات پر خوش ہو جاتا ہے' پس ایسا عفو

کس طرح خُلق میں داخل ہو سکتا ہے۔ خُلق بھی اُسی صورت میں داخل ہوگا جب موقع اور محل پر استعمال ہو ورنہ صرف ایک طبعی قوت ہوگی" دنیا میں بہت تھوڑے لوگ ایسے ہیں جو طبعی قوت اور خُلق میں فرق کر سکتے ہیں، ہم بار بار کہہ چکے ہیں کہ حقیقی خُلق اور طبعی حالتوں میں یہ فرق ہے کہ خُلق ہمیشہ محل اور موقع کی پابندی اپنے ساتھ رکھتا ہے اور طبعی قوت بےمحل بھی ظاہر ہو جاتی ہے" یوں تو چارپایوں میں گائے بھی بے شر ہے اور بکری بھی دل کی غریب ہے مگر ہم اُن کو ان خُلقوں سے متصف نہیں کہہ سکتے کہ اُن کو محل اور موقع کی عقل نہیں دی گئی۔ خدا کی سچی اور کامل کتاب نے ہر خُلق کے ساتھ محل اور موقع کی شرط لگا دی ہے"

(۲) دوسرا خُلق۔ عدل، (۳) تیسرا خُلق۔ احسان، (۴) چوتھا خُلق۔ اِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی۔ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے:۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآءِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ۔ یعنی اللہ تعالیٰ کا یہ حکم ہے کہ نیکی کے مقابلہ میں نیکی کرو اور اگر عدل سے بڑھ کر احسان کا موقع اور محل ہو تو وہاں احسان کرو، اور اگر احسان سے بڑھ کر قریبوں کی طرح طبعی جوش سے نیکی کرنے کا محل ہو تو وہاں طبعی ہمدردی سے نیکی کرو اور اس سے خدا تعالیٰ منع فرماتا ہے کہ تم

حدودِ اعتدال سے آگے گزر جاؤ یا احسان کے بارے میں منکرانہ حالت تم سے صادر ہو جس سے عقل انکار کرے۔ یعنی یہ کہ تم بے محل احسان کرو یا محل پر احسان کرنے سے دریغ کرو یا یہ کہ تم محل پر ایتاء ذی القربیٰ کے خُلق میں کچھ کمی اختیار کرو یا حد سے زیادہ رحم کی بارش کرو" اس آیت کریمہ میں ایصالِ خیر کے تین درجوں کا بیان ہے۔

اوّل یہ درجہ کہ نیکی کے مقابلہ پر نیکی کیجائے، یہ تو کم درجہ ہے اور ادنیٰ درجہ کا بھلا مانس آدمی بھی یہ خُلق حاصل کرسکتا ہے کہ اپنے نیکی کرنے والوں کے ساتھ نیکی کرتا رہے۔" اس کا نام عدل ہے۔

دُوم ابتداءً آپ ہی نیکی کرنا اور بغیر کسی کے حق کے بطور احسان اُس کو فائدہ پہنچانا، یہ پہلے درجہ سے مشکل ہے۔ اور یہ خُلق اوسط درجہ کا ہے، اکثر لوگ غریبوں پر احسان کرتے ہیں، اور احسان میں یہ ایک عیب مخفی ہے کہ احسان کرنے والا خیال کرتا ہے کہ میں نے احسان کیا ہے اور کم سے کم وہ اپنے احسان کے عوض میں شکریا دعا چاہتا ہے اور اگر کوئی ممنونِ منت اُس کا مخالف ہو جائے تو اُس کا نام" احسان فراموش" رکھتا ہے، بعض وقت اپنے احسان کی وجہ سے اُس پر فوق الطاقت بوجھ ڈال دیتا ہے اور اپنا احسان اُس کو یاد دلاتا ہے۔ جیسا کہ احسان کرنے والوں کو خدا تعالیٰ نے متنبہ کرنے کیلئے فرمایا ہے۔ لَا تُبْطِلُوْا صَدَقَاتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى" یعنی اے

احسان کرنے والو اپنے صدقات کو "جن کی بِنا صدق پر چاہیئے" احسان یاد دلانے اور دُکھ دینے کے ساتھ برباد مت کرو" یعنی صدقہ کا لفظ صِدق سے مشتق ہے۔ پس اگر دل میں صِدق اور اخلاص نہ رہے تو وہ صدقہ صدقہ نہیں رہتا، بلکہ ایک ریاکاری کی حرکت ہوجاتی ہے غرض احسان کرنے والے میں یہ ایک خامی ہوتی ہے کہ کبھی غصّہ میں آکر اپنا احسان یاد بھی دلا دیتا ہے، اسی وجہ سے خدا تعالیٰ نے احسان کرنے والوں کو ڈرایا۔ اس کا نام اِحسان ہے۔"

سوم۔ احسان کرنے کے بعد احسان کا بالکل خیال نہ ہو اور نہ شکرگزاری پر نظر ہو بلکہ ایسی ہمدردی کے جوش سے نیکی صادر ہو جیسا کہ ایک نہایت قریبی مثلاً والدہ محض ہمدردی کے جوش سے اپنے بیٹے کے ساتھ نیکی کرتی ہے" یہ آخری درجہ ہے اس سے آگے ترقی کرنا ناممکن ہے۔ اس کا نام اِیتاءِ ذِی القُربیٰ ہے۔"

لیکن خدا تعالیٰ نے ان تمام اعمالِ خیر کی قسموں کو محل اور موقعہ سے وابستہ کر دیا ہے اور آیت موصوفہ میں صاف فرما دیا ہے کہ اگر یہ نیکیاں اپنے محل پر مستعمل نہ ہوں گی تو پھر یہ بدیاں ہوجائینگی بجائے عدل فحشا بن جائے گا۔ یعنی حد سے اتنا تجاوز کرنا کہ ناپاک صورت ہو جائے، اور ایسا ہی بجائے احسان کے منکر کی صورت نکل آئیگی یعنی وہ صورت جس سے عقل اور کانشنس انکار کرتا ہے، اور بجائے ایتاءِ ذِی القربیٰ کے بغی بن جائے گا۔ یعنی وہ بے محل ہمدردیکا

جوش ایک بُری صورت پیدا کریگا۔ اصل میں بغی اُس بارش کو کہتے ہیں جو حد سے زیادہ برس جائے۔ اور کھیتوں کو تباہ کر دے اور یا حق واجب میں کمی رکھنے کو بغی کہتے ہیں اور یا حق واجب سے افزونی کرنا بھی بغی ہے" غرض اِن تینوں میں سے جو محل پر صادر نہ ہوگا وہی خراب سیرت ہو جائے گی۔ اسی لئے اِن تینوں کے ساتھ موقع اور محل کی شرط لگا دی ہے۔ اس جگہ یاد رہے کہ مجرد عدل یا احسان یا ہمدردی ذی القربٰی کو خُلق نہیں کہہ سکتے۔ بلکہ انسان میں یہ سب طبعی حالتیں اور طبعی قوتیں ہیں جو بچّوں میں بھی وجودِ عقل سے پہلے پائی جاتی ہیں، مگر خُلق کے لئے عقل شرط ہے اور نیز یہ شرط ہے۔ کہ ہر طبعی قوت محل اور موقع پر استعمال ہو۔

اور پھر احسان کے بارے میں اور بھی ضروری ہدایتیں قرآن شریعت میں ہیں اور سب کو "الف لام" کے ساتھ (جو خاص کرنے کے لئے آتا ہے) استعمال فرما کر موقعہ اور محل کی طرف اشارہ فرمایا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔

یَآ اَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَنۡفِقُوۡا مِنۡ طَیِّبٰتِ مَا کَسَبۡتُمۡ وَلَا تَیَمَّمُوا الۡخَبِیۡثَ مِنۡہُ لَا تُبۡطِلُوۡا صَدَقٰتِکُمۡ بِالۡمَنِّ وَالۡاَذٰی کَالَّذِیۡ یُنۡفِقُ مَالَہٗ رِئَآءَ النَّاسِ اَحۡسِنُوۡا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ اِنَّ الۡاَبۡرَارَ یَشۡرَبُوۡنَ مِنۡ کَاۡسٍ کَانَ مِزَاجُہَا کَافُوۡرًا عَیۡنًا یَّشۡرَبُ بِہَا

عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا تَفْجِيْرًا ۔ وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ
مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ
مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى
الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَ
فِى الرِّقَابِ ۔ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ
بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا ۝ وَالَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖ
اَنْ يُّوْصَلَ وَيَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَيَخَافُوْنَ سُوْٓءَ الْحِسَابِ ۔ وَفِىْٓ
اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِى السَّرَّآءِ
وَالضَّرَّآءِ ، وَاَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً
اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا
وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِى الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِىْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ
حَكِيْمٌ ۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۔ وَاٰتِ
ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ
تَبْذِيْرًا ۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى
وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِى الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ
بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ
مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا ۝ اَلَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ
بِالْبُخْلِ وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۝ ترجمہ اے ایمان والو

تم اُن مالوں میں سے لوگوں کو بطریقِ سخاوت یا احسان یا صدقہ وغیرہ دو جو تمہاری پاک کمائی ہے۔ یعنی جس میں چوری یا رشوت یا غبن کا مال یا ظلم کے روپیہ کی آمیزش نہیں اور یہ مقصد تمہارے دل سے دور رہے کہ ناپاک مال لوگوں کو دو، اور دوسری بات یہ ہے کہ اپنی خیرات اور مروّت کو احسان رکھنے اور دکھ دینے کے ساتھ باطل نہ کرو یعنی اپنے ممنون منت کو کبھی یہ نہ جتلاؤ کہ ہم نے تجھے یہ دیا تھا اور نہ اُس کو دُکھ دو کہ اس طرح تمہارا احسان باطل ہو جائیگا اور نہ ایسا طریق پکڑو کہ تم اپنے مالوں کو ریا کاری کے ساتھ خرچ کرو خدا کی مخلوق سے احسان کرو۔ کہ خدا احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے، جو لوگ حقیقی نیکی کرنے والے ہیں اُن کو وہ جام پلائے جائیں گے جن کی ملونی کافور ہوگی یعنی دنیا کی سوزشیں اور حسرتیں اور ناپاک خواہشیں اُن کے دل سے دور کردی جائیں گی، کافور کفر سے مشتق ہے اور کفر لغت عرب میں دبانے اور ڈھانکنے کو کہتے ہیں مطلب یہ کہ اُن کے ناجائز جذبات دبائے جائیں گے اور وہ پاک باطن ہو جائیں گے اور معرفت کی خنکی اُن کو پہنچے گی، پھر فرماتا ہے کہ وہ لوگ قیامت کو اس چشمہ کا پانی پئیں گے جس کو وہ آج اپنے ہاتھ سے چیر رہے ہیں، اس جگہ بہشت کی فلاسفی کا ایک.... گہرا راز بتایا ہے جس کو سمجھنا ہو سمجھ لے۔ اور پھر فرمایا کہ حقیقی نیکی کرنے والوں کی یہ خصلت ہے کہ وہ محض خدا کی محبت کے لئے وہ

کھانے جو خود پسند کرتے ہیں مسکینوں اور یتیموں اور قیدیوں کو
کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تم پر کوئی احسان نہیں کرتے بلکہ
یہ کام صرف اس بات کے لئے کرتے ہیں کہ خدا ہم سے راضی ہو اور
اُس کے منہ کے لئے یہ خدمت ہے، ہم تم سے نہ تو کوئی بدلہ چاہتے
ہیں اور نہ یہ چاہتے ہیں کہ تم ہمارا شکر کرتے پھرو، یہ اشارا اس بات کی
طرف ہے کہ ایصالِ خیر کی تیسری قسم جو محض ہمدردی کے جوش سے
ہے وہ طریق بجالاتے ہیں، سچے نیکوں کی یہ عادت ہوتی ہے کہ خدا کی
رضا جوئی کے لئے اپنے قریبوں کی مدد اپنے حال سے کرتے ہیں
اور نیز اُس مال میں سے یتیموں کے تعہد اور اُن کی پرورش و تعلیم
وغیرہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ اور مسکینوں کو فقر و فاقہ سے بچاتے
ہیں اور مسافروں اور سوالیوں کی خدمت کرتے ہیں اور ان مالوں کو
غلاموں کے آزاد کرانے کے لئے اور قرضداروں کو سبکدوش کرنے کے
لئے بھی دیتے ہیں اپنے خرچوں میں نہ تو اسراف کرتے ہیں نہ تنگدلی
کی عادت رکھتے ہیں اور میانہ روش چلتے ہیں، پیوند کرنے کی
جگہ پیوند کرتے ہیں اور خدا سے ڈرتے ہیں، اور اُن کے مالوں میں
سوالیوں اور بے زبانوں کا حق ہے، بے زبانوں سے مراد کتے، بلیاں
چڑیاں، بیل، گدھے اور دوسری چیزیں ہیں، وہ تکلیفوں اور کم آمدنی
کی حالت میں اور قحط کے دنوں میں سخاوت سے دل تنگ نہیں
ہو جاتے بلکہ تنگی کی حالت میں بھی اپنے مقدور کے موافق سخاوت

کرتے رہتے ہیں وہ کبھی پوشیدہ خیرات کرتے رہتے ہیں اور کبھی ظاہر، پوشیدہ اس لئے کہ ریاکاری سے بچیں اور ظاہر اس لئے کہ دوسرا کو ترغیب دیں، خیرات اور صدقات وغیرہ پر جو مال دیا جائے اُسمیں ملحوظ رہنا چاہیئے کہ پہلے جس قدر محتاج ہوں اُن کو دیا جائے ہاں جو خیرات کے مال کا تعہد کریں یا اس کے لئے انتظام و اہتمام کریں اُن کو بھی خیرات کے مال سے کچھ مل سکتا ہے اور نیز کسی کو برائی سے بچانے کے لئے بھی اس مال میں سے دے سکتے ہیں، ایسا ہی وہ مال غلاموں کے آزاد کرنے کے لئے اور محتاج اور قرضداروں اور آفت زدہ لوگوں کی مدد کے لئے بھی اور دوسری راہوں میں جو محض خدا کے لئے ہوں وہ مال خرچ ہوگا۔ تم حقیقی نیکی کو ہرگز نہیں پا سکتے جب تک بنی نوع انسان کی ہمدردی میں وہ مال خرچ نہ کرو۔ جو تمھارا پیارا مال ہے، غریبوں کا حق ادا کرو، مسکینوں اور مسافروں کی خدمت کرو اور فضولیوں سے اپنے تئیں بچاؤ۔ یعنی جو بیاہوں اور شادیوں میں اور طرح طرح کی عیاشیوں میں اور لڑکا پیدا ہونے میں ہوتے ہیں، جو مال اسراف سے خرچ کیا جاتا ہے اس سے اپنے تئیں بچاؤ تم ماں باپ سے نیکی کرو اور قریبوں اور یتیموں اور مسکینوں اور ہمسایہ سے جو تمھارا قریبی ہے، اور ہمسایہ سے جو بیگانہ ہے، اور مسافر سے اور نوکر و غلام اور گھوڑے، بکری، بیل، گائے سے اور حیوانات سے جو تمھارے قبضہ میں ہوں، کیونکہ خدا تعالیٰ کو جو تمھارا خدا ہے۔ یہی

عادتیں پسند ہیں، وہ لاپروا ہے اور خود غرضوں سے محبت نہیں کرتا اور ایسے لوگوں کو نہیں چاہتا جو بخیل ہیں اور لوگوں کو بخل کی تعلیم دیتے ہیں اور اپنے مال کو چھپاتے ہیں یعنی محتاجوں کو کہتے ہیں کہ ہمارے پاس کچھ نہیں۔

شجاعت

منجملہ انسان کی طبعی حالتوں کے ایک وہ حالت ہے جو شجاعت سے مشابہ ہوتی ہے جیسا کہ شیرخوار بچہ بھی اسی قوت کی وجہ سے کبھی آگ میں ہاتھ ڈالنے لگتا ہے۔ کیونکہ انسان کا بچہ بباعث فطرتی جوہر غلبۂ انسانیت کے ڈرانے والے نمونوں سے پہلے کسی چیز سے بھی نہیں ڈرتا، اس حالت میں انسان نہایت بیباکی سے شیروں اور دوسرے جنگلی درندوں کا بھی مقابلہ کرتا ہے اور تن تنہا مقابلہ کے لئے آدمیوں سے لڑنے کے لئے نکلتا ہے اور لوگ جانتے ہیں کہ بڑا بہادر ہے، لیکن یہ صرف ایک طبعی حالت ہے کہ جس طرح اور درندوں میں پیدا ہوتی ہے بلکہ کتوں میں بھی پائی جاتی ہے، حقیقی شجاعت جو محل اور موقعے کے ساتھ خاص ہے اور جو اخلاق فاضلہ میں سے ایک خلق ہے وہ محل اور موقعے کے اُن اُمور کا نام ہے جن کا ذکر خدا تعالیٰ کے پاک کلام میں اس طرح پر آیا ہے۔ وَالصّٰبِرِیْنَ فِی الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِیْنَ الْبَاْسِ ۔ وَالَّذِیْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ

وَجْهِ رَبِّهِمْ۔ اَلَّذِيْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَاءَ النَّاسِ یعنی بہادر ہیں وہ کہ جب لڑائی کا موقع آپڑے یا اُن پر کوئی مصیبت پڑے تو بھاگتے نہیں اُن کا صبر لڑائی اور سختیوں کے وقت میں خدا کی رضامندی کے لئے ہوتا ہے اور وہ اس کے چہرے کے طالب ہوتے ہیں نہ کہ بہادری دکھانے کے، اُن کو ڈرایا جاتا ہے کہ لوگ تمہیں سزا دینے کے لئے اتفاق کر گئے ہیں سو تم لوگوں سے ڈرو، پس ڈرانے سے اُن کا ایمان اور بھی بڑھتا ہے اور کہتے ہیں کہ خدا ہمیں کافی ہے۔ یعنی اُن کی شجاعت کتوں اور درندوں کی طرح نہیں ہوتی جو صرف طبعی جوش پر مبنی ہو جس کا ایک ہی پہلو پر میل ہو بلکہ اُن کی شجاعت دو پہلو رکھتی ہے۔ کبھی تو وہ اپنی ذاتی شجاعت سے اپنے نفس کا مقابلہ کرتے ہیں اور اس پر غالب آتے ہیں اور کبھی جب دیکھتے ہیں کہ دشمن کا مقابلہ قرین مصلحت ہے تو نہ صرف جوشِ نفس سے بلکہ سچائی کی مدد کے لئے دشمن کا مقابلہ کرتے ہیں۔ مگر نہ اپنے نفس پر بھروسہ کر کے بلکہ خدا پر بھروسہ کر کے بہادری دکھاتے ہیں اور اُن کی شجاعت میں کوئی ریاکاری اور اور خودبینی نہیں ہوتی اور نہ نفس کی پیروی بلکہ ہر پہلو سے خدا کی رضا مقدم ہوتی ہے۔" اِن آیات میں یہ سمجھایا گیا ہے کہ حقیقی شجاعت کی جڑ

صبر اور ثابت قدمی ہے اور ہر جذبہ نفسانی یا بلا جو دشمنوں کی طرح حملہ کرے اس کے مقابلہ پر ثابت قدم رہنا اور بزدل ہو کر بھاگ نہ جانا شجاعت ہے، سو انسانی شجاعت اور ایک درندہ کی شجاعت میں بڑا فرق ہے درندہ ایک ہی پہلو پر جوش اور غضب سے کام لیتا ہے اور انسان جو حقیقی شجاعت رکھتا ہے وہ مقابلہ اور ترکِ مقابلہ میں جو کچھ قرینِ مصلحت ہو وہ اختیار کر لیتا ہے۔"

سچّائی

منجملہ انسان کی طبعی حالتوں کے جو اُس کی فطرت کا خاصّہ ہے ایک سچّائی ہے، انسان جب تک کوئی غرضِ نفسانی اس کی محرّک نہ ہو جھوٹ بولنا نہیں چاہتا اور جھوٹ کے اختیار کرنے میں ایک طرح کی نفرت اور قبض اپنے دل میں پاتا ہے، اسی وجہ سے جس شخص کا صریح جھوٹ ثابت ہو جائے اس سے ناخوش ہوتا ہے اور اُس کو تحقیر کی نظر سے دیکھتا ہے۔ لیکن صرف یہی طبعی حالت اخلاق میں داخل نہیں ہو سکتی۔ بلکہ بچّے اور دیوانے بھی اس کے پابند رہ سکتے ہیں، سو اصل حقیقت یہ ہے کہ جب تک انسان اُن نفسانی اغراض سے علٰحدہ نہ ہو جو راست گوئی سے روک دیتی ہیں تب تک حقیقی طور پر راست گو نہیں ٹھہر سکتا، کیونکہ اگر انسان صرف ایسی باتوں میں سچ بولے جن میں اس کا چنداں حرج نہیں اور اپنی عزت یا مال

یا جان کے نقصان کے وقت جھوٹ بول جائے اور سچ بولنے سے خاموش رہے تو اس کو دیوانوں اور بچوں پر کیا فوقیت ہے ؟ کیا پاگل اور نابالغ لڑکے بھی ایسا سچ نہیں بولتے ؟ دنیا میں ایسا کوئی نہ ہوگا جو بغیر کسی تحریک کے خواہ نخواہ جھوٹ بولے، پس ایسا سچ جو کسی نقصان کے وقت چھوڑ دیا جائے حقیقی اخلاق میں ہرگز داخل نہیں ہو سکتا، سچ بولنے کا بڑا بھاری محل اور موقع وہی ہے جس میں اپنی جان یا مال یا آبرو کا اندیشہ ہو۔ اس میں خدا کی یہ تعلیم ہے۔

فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاءُ اِذَا مَا دُعُوْا وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ ط وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى كُوْنُوْا قَوَّامِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰى اَلَّا تَعْدِلُوْا وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ۔ ترجمہ بتوں کی پرستش اور جھوٹ بولنے سے پرہیز کرو یعنی جھوٹ بھی ایک بت ہے جس پر بھروسہ کرنیوالا خدا کا بھروسہ چھوڑ دیتا ہے سو جھوٹ بولنے سے خدا بھی ہاتھ سے جاتا ہے۔ پھر فرمایا کہ جب تم سچی گواہی کیلئے

بلائے جاؤ تو جانے سے انکار مت کرو اور سچی گواہی کو مت چھپاؤ جو چھپائیگا اُس کا دل گنہگار ہے اور جب تم بولو تو وہی بات منہ سے نکالو جو سراسر سچ اور عدالت کی بات ہے اگرچہ تم اپنے کسی قریبی پر گواہی دو، حق اور انصاف پر قائم ہو جاؤ اور چاہیے کہ ہر گواہی تمہاری خدا کے لئے ہو، جھوٹ مت بولو، اگرچہ سچ بولنے سے تمہاری جانوں کو نقصان پہنچے یا اُس سے تمہارے ماں باپ کو ضرر پہنچے یا اور قریبیوں کو جیسے بیٹے وغیرہ، اور چاہیے کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں سچی گواہی سے نہ روکے۔ سچے مرد اور سچی عورتیں بڑے بڑے اجر پائیں گے، اُن کی عادت ہے کہ اوروں کو بھی سچ کی نصیحت کرتے ہیں اور جھوٹوں کی مجلسوں میں نہیں بیٹھتے۔"

صبر

منجملہ انسان کے طبعی اُمور کے ایک صبر ہے جو اُس کو اُن مصیبتوں بیماریوں اور دکھوں پر کرنا پڑتا ہے جو اُس پر ہمیشہ پڑتے رہتے ہیں اور انسان بہت سے سیاپے اور جزع فزع کے بعد صبر اختیار کرتا ہے، لیکن جاننا چاہیئے کہ خدا تعالیٰ کی پاک کتاب کی رُو سے وہ صبر اخلاق میں داخل نہیں ہے بلکہ وہ ایک حالت ہے جو تھک جانے کے بعد ضرورتاً ظاہر ہو جاتی ہے یعنی انسان کی طبعی حالتوں میں سے یہ بھی ایک حالت ہے کہ وہ مصیبت کے ظاہر ہونے کے وقت

پہلے روتا، چیختا، سر پیٹتا ہے آخر بہت سا بخار نکال کر جوش تھم جاتا ہے اور انتہا تک پہنچکر پیچھے ہٹنا پڑتا ہے' پس یہ دونوں حرکتیں طبعی حالتیں ہیں اُن کو خُلق سے کچھ تعلق نہیں"۔ بلکہ اس کے متعلق خُلق یہ ہے کہ جب کوئی چیز اپنے ہاتھ سے جاتی رہے اور اس چیز کو خدا تعالیٰ کی امانت سمجھکر کوئی شکایت منہ پر نہ لاوے اور یہ کہے کہ خدا کا تھا خدا نے لے لیا اور ہم اس کی رضا کے ساتھ راضی ہیں" اس خُلق کے متعلق خدا تعالیٰ کا پاک کلام قرآن شریف ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے۔ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝ یعنی اے مومنو ہم تمہیں اس طرح پر آزماتے رہیں گے کہ کبھی کوئی خوفناک حالت تم پر طاری ہوگی اور کبھی فقر و فاقہ تمہارے شامل حال ہوگا اور تمہارا مالی نقصان ہوگا اور کبھی جانوں پر آفت آئے گی اور کبھی اپنی محنتوں میں ناکام رہوگے اور حسب المراد نتیجے کوششوں کے نہ نکلیں گے اور کبھی تمہاری پیاری اولاد مرے گی، پس ان لوگوں کو خوشخبری ہو کہ جب اُن کو کوئی مصیبت پہنچے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم خدا کی چیزیں اور امانتیں اور اس کے مملوک ہیں پس حق یہی ہے کہ جس کی امانت ہے اُسکی

طرف رجوع کرے، یہی لوگ ہیں جن پر خدا کی رحمتیں ہیں اور یہی لوگ ہیں جو خدا کی راہ کو پا گئے۔" غرض اس خُلق کا نام صبر اور رضا برضاء الٰہی ہے اور ایک طور سے اِس خُلق کا نام عدل بھی ہے کیونکہ جب خدا تعالیٰ انسان کی تمام زندگی میں اُس کی مرضی کے موافق کرتا ہے اور ہزارہا باتیں اُس کی مرضی کے موافق ظہور میں لاتا ہے اور انسان کی خواہش کے مطابق اس قدر نعمتیں اُس کو دے رکھی ہیں کہ انسان شمار نہیں کر سکتا۔ تو پھر یہ شرطِ انصاف نہیں کہ اگر وہ کبھی اپنی مرضی بھی منوانا چاہے تو انسان منحرف ہو اور اُس کی رضا کے ساتھ راضی نہ ہو اور چون و چرا کرے یا بے دین اور بے راہ ہو جائے۔"

ہمدردیِ خُلق

منجملہ انسان کے طبعی اُمور کے جو اس کی طبیعت کے لازمِ حال ہیں۔ ہمدردیِ خلق کا ایک جوش ہے، قومی حمایت کا جوش بالطبع ہر مذہب کے لوگوں میں پایا جاتا ہے اور اکثر لوگ طبعی جوش سے اپنی قوم کی ہمدردی کے لئے دوسروں پر ظلم کر دیتے ہیں گویا اُن کو انسان نہیں سمجھتے، سو اس حالت کو خلق نہیں کہہ سکتے یہ فقط ایک طبعی جوش ہے اور اگر غور سے دیکھا جائے تو یہ

طبعی حالت کوّوں وغیرہ پرندوں میں بھی پائی جاتی ہے کہ ایک کوّے کے مرنے پر ہزارہا کوّے جمع ہو جاتے ہیں، لیکن یہ عادت انسانی اخلاق میں اُس وقت داخل ہو گی جب یہ ہمدردی انصاف اور عدل کی رعایت سے محل اور موقع پر ہو۔ اس وقت یہ ایک عظیم الشان خلق ہو گا جس کا نام عربی میں مواسات اور فارسی میں ہمدردی ہے، اسی کی طرف اللہ جل شانہ قرآن شریف میں اشارہ فرماتا ہے۔ تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ۔ وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ط وَلَا تَكُنْ لِّلْخَآئِنِيْنَ خَصِيْمًا وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِيْنَ يَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ خَوَّانًا اَثِيْمًا۔ یعنی اپنی قوم کی ہمدردی اور اعانت فقط نیکی کے کاموں میں کرنی چاہیئے، اور ظلم اور زیادتی کے کاموں میں اُن کی اعانت ہرگز نہیں کرنا چاہیئے اور قوم کی ہمدردی میں سرگرم رہو۔ حکومت، اور خیانت کرنے والوں کی طرف سے مت جھگڑو، جو خیانت کرنے سے باز نہیں آتے، خدا تعالیٰ خیانت پیشہ لوگوں کو دوست نہیں رکھتا۔"

خدا کی تلاش

منجملہ انسان کی طبعی حالتوں کے جو اُس کی فطرت کو لازم پڑی

ہوئی ہیں ایک اُس برتر ہستی کی تلاش ہے جس کے لئے اندر ہی اندر انسان کے دل میں ایک کشش موجود ہے اور اس تلاش کا اثر اسی وقت سے محسوس ہونے لگتا ہے جبکہ بچہ ماں کے رحم سے باہر آتا ہے کیونکہ بچہ پیدا ہوتے ہی پہلے اپنی روحانی خاصیت جو دکھاتا ہے وہ یہی ہے کہ ماں کی طرف جُھکا جاتا ہے اور طبعاً اپنی ماں کی محبت رکھتا ہے اور پھر جیسے جیسے حواس اُس کے کھلتے جاتے ہیں اور شگوفہ فطرت اُس کا کھلتا جاتا ہے یہ کششِ محبت جو اُس کے اندر چھپی ہوئی تھی اپنا رنگ و روپ نمایاں طور پر دکھاتی جاتی ہے پھر تو یہ ہوتا ہے کہ بجز اپنی ماں کی گود کے کسی جگہ آرام نہیں پاتا اور پورا آرام اُس کا ماں ہی کی کنارِ عاطفت میں ہوتا ہے۔ اور اگر ماں سے علیحدہ کر دیا جائے اور دُور ڈال دیا جائے تو اُس کا تمام عیش تلخ ہو جاتا ہے اور اگرچہ اُس کے آگے نعمتوں کا ایک ڈھیر ڈال دیا جائے تب بھی وہ اپنی سچی خوشحالی ماں کی گود ہی میں دیکھتا ہے اور اس کے بغیر کسی طرح آرام نہیں پاتا، سو وہ کششِ محبت جو اُس کو اپنی ماں کی طرف پیدا ہوتی ہے وہ کیا چیز ہے؟ درحقیقت یہ وہی کشش ہے جو معبودِ حقیقی کے لئے بچہ کی فطرت میں رکھی گئی ہے، بلکہ ہر جگہ جو انسان تعلقِ محبت پیدا کرتا ہے درحقیقت وہی کشش کام کر رہی ہے اور ہر جگہ جو یہ عاشقانہ جوش دکھاتا ہے درحقیقت اُسی محبت کا ایک عکس ہے گویا دوسری چیزوں کو

اُٹھا اُٹھا کر ایک گم شدہ چیز کو تلاش کر رہا ہے جس کا نام اب بھول گیا ہے، سو انسان کا مال یا اولاد یا بیوی سے محبت کرنا یا کسی خوش آواز کے گیت کی طرف اس کی روح کا کھنچنا درحقیقت اسی گم شدہ محبوب کی تلاش ہے اور چونکہ انسان اس دقیق در دقیق ہستی کو جو آگ کی طرح ہر ایک میں مخفی اور سب پر پوشیدہ ہے۔ اپنی جسمانی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتا اور نہ اپنی ناتمام عقل سے اس کو پا سکتا ہے اس لیئے اس کی معرفت میں انسان کو بڑی بڑی غلطیاں لگی ہیں۔ اور سہو کاریوں سے اس کا حق دوسروں کو دیا گیا ہے۔"

پہلی دلیل ہستئ باری تعالیٰ پر وہ نہایت واضح اور صاف طور سے خود خدا نے قرآن شریف میں یہ خوب مثال دی ہے "کہ دنیا ایک ایسے شیش محل کی طرح ہے جس کی زمین کا فرش نہایت مصفا شیشوں سے کیا گیا ہے اور پھر ان شیشوں کے نیچے پانی چھوڑا گیا جو نہایت تیزی سے چل رہا ہے اب ہر ایک نظر جو شیشوں پر پڑتی ہے وہ اپنی غلطی سے ان شیشوں کو بھی پانی سمجھ لیتی ہے اور پھر انسان ان شیشوں پر چلنے سے ایسا ڈرتا ہے جیسا کہ پانی سے ڈرنا چاہیئے حالانکہ وہ درحقیقت شیشے ہیں مگر صاف اور شفاف" سو یہ بڑے بڑے اجرام جو نظر آتے ہیں۔ جیسے آفتاب و

ماہتاب وغیرہ یہ تو ہی صاف شیشے ہیں جن کی غلطی سے پرستش کی گئی اور ان کے نیچے ایک اعلیٰ طاقت کام کر رہی ہے جو ان شیشوں کے پردے میں پانی کی طرح بڑی تیزی سے چل رہی ہے اور مخلوق پرستوں کی نظر کی یہ غلطی ہے کہ انھیں شیشوں کی طرف اس کام کو منسوب کر رہے ہیں جو ان کے نیچے کی طاقت دکھا رہی ہے" یہی تفسیر اس آیتِ کریمہ کی ہے جو اِنَّهٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِيْرَ ہے" الغرض چونکہ خدا تعالیٰ کی ذات باوجود نہایت روشن ہونے کے پھر بھی نہایت مخفی ہے۔ اس لئے اس کی شناخت کے لئے صرف یہ نظام جسمانی جو ہماری نظروں کے سامنے ہے کافی نہ تھا اور یہی وجہ ہے کہ ایسے نظام پر مدار رکھنے والے باوجودیکہ اس ترتیبِ ابلغ ومحکم کو (جو صدہا عجائبات پر مشتمل ہے) نہایت غور سے دیکھتے رہے بلکہ ہیئتِ طبعی اور فلسفہ میں وہ مہارتیں پیدا کیں کہ گویا آسمان اور زمین کے اندر دھس گئے مگر پھر بھی شکوک اور شبہات کی تاریکی سے نہ نکل سکے اور نجات نہ پا سکے" اکثر ان میں طرح طرح کی خطاؤں میں مبتلا ہو گئے اور بیہودہ اوہام میں پڑ کر کہیں کے کہیں چلے گئے اور اگر اُن کو اس صانع کے وجود کی طرف کچھ خیال بھی آیا تو بس اسی قدر کہ اس اعلیٰ اور عمدہ نظام کو دیکھ کر اُن کے دل میں یہ خیال آیا کہ اس عظیم الشان سلسلہ کا (جو پُر حکمت نظام اپنے ساتھ رکھتا ہے) کوئی پیدا کرنے والا ضرور چاہیئے۔

مگر ظاہر ہے کہ یہ خیال ناتمام اور یہ معرفت ناقص ہے کیونکہ یہ کہنا کہ "اس سلسلہ کے لئے ایک خدا کی ضرورت ہے" اس دوسرے کلام سے ہرگز مساوی نہیں کہ "وہ خدا درحقیقت ہے بھی"۔ غرض اُن کی یہ معرفت قیاسی معرفت تھی جو دل کو اطمینان اور سکینت نہیں بخش سکتی اور نہ شکوک کو بکلی دل پر سے اٹھا سکتی ہے اور نہ یہ ایسا پیالہ ہے جس سے وہ پیاس معرفت تامّہ کی بجھ سکے جو انسان کی فطرت کو لگائی گئی ہے بلکہ ایسی معرفت ناقصہ نہایت پُرخطر ہوتی ہے کیونکہ بہت شور ڈالنے کے بعد پھر آخر ہیچ اور نتیجہ ندارد ہے، غرض جب تک خود خدا تعالیٰ اپنے موجود ہونے کو اپنے کلام سے ظاہر نہ کرے جیسا کہ اُس نے اپنے کلام سے ظاہر کیا۔ تب تک صرف کام کا ملاحظہ تسلی بخش نہیں ہے؛

مثلاً اگر ہم ایک ایسی بند کوٹھری کو دیکھیں جس میں یہ بات عجیب ہو کہ اندر سے کنڈیاں لگائی گئی ہوں تو اس فعل سے ہم ضرور اوّل یہ خیال کریں گے کہ کوئی انسان اندر ہے جس نے اندر سے زنجیر کو لگایا ہے کیونکہ باہر سے اندر کی زنجیروں کو لگانا غیر ممکن ہے لیکن جب ایک مدت تک بلکہ برسوں تک باوجود بار بار آواز دینے کے اس انسان کی طرف سے کوئی آواز نہ آئے تو آخر ہماری یہ رائے کہ کوئی اندر ہے بدل جائیگی۔ اور یہ خیال کریں گے کہ اندر کوئی نہیں بلکہ کسی حکمت عملی سے اندر کی کنڈیاں لگائی گئی ہیں" یہی حال ان فلاسفروں کا ہے جنہوں نے صرف فعل کے مشاہدہ پر اپنی

معرفت کو ختم کر دیا ہے یہ بڑی غلطی ہے جو خدا کو ایک مردہ کی طرح سمجھا جائے جس کو قبر سے نکالنا صرف انسان کا کام ہے اگر خدا ایسا ہے جس کا پتہ صرف انسانی کوشش نے لگایا ہے تو ایسے خدا کی نسبت ہماری سب امیدیں عبث ہیں بلکہ خدا تو وہی ہے جو ہمیشہ سے اور قدیم سے آپ انا الموجود کہہ کر لوگوں کو اپنی طرف بلا رہا ہے، یہ بڑی گستاخی ہوگی اگر ہم ایسا خیال کریں کہ اس کی معرفت میں انسان کا احسان اُس پر ہے اور اگر فلاسفر نہ ہوتے تو گویا وہ گم کا گم ہی رہتا، اور یہ کہنا کہ خدا کیونکر بول سکتا ہے؟ کیا اُس کی زبان ہے؟ یہ بھی ایک بری بے باکی ہے، کیا اُس نے جسمانی ہاتھوں کے بغیر تمام آسمانی اجرام اور زمین کو نہیں بنایا! کیا وہ جسمانی آنکھوں کے بغیر تمام دنیا کو نہیں دیکھتا؟ کیا وہ جسمانی کانوں کے بغیر ہماری آوازیں نہیں سنتا؟ پس کیا یہ ضروری نہ تھا کہ اسی طرح وہ کلام بھی کرے،۔ یہ بات بھی ہرگز صحیح نہیں ہے کہ خدا کا کلام کرنا آگے نہیں بلکہ پیچھے رہ گیا ہے۔ ہم اُسکے کلام اور مخاطبات پر کسی زمانہ تک مہر نہیں لگاتے بیشک وہ اب بھی ڈھونڈھنے والوں کو الہامی چشمہ سے مالامال کرنیکو تیار ہے جیسا کہ پہلے تھا اور اب بھی اُس کے فیضان کے

ایسے دروازے کھلے ہیں جیسا کہ پہلے تھے ہاں ضرورتوں کے ختم ہونے پر شریعتیں اور حدود ختم ہو گئیں) اور تمام رسالتیں اور نبوتیں اپنے آخری نقطہ پر آکر جو ہمارے سیدو مولے حضرت محمد مصطفےٰ احمد مجتبےٰ صلے اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کا وجود باوجود تھا کمال کو پہنچ گئیں" اس آخری نور کا عرب سے ظاہر ہونا بھی خالی از حکمت نہ تھا عرب بنی اسمٰعیل کی وہ قوم تھی جو اسرائیل سے منقطع ہو کر حکمت الٰہی سے بیابانِ فاران میں ڈال دی گئی تھی اور فاران کے معنی ہیں" دو فرار کرنے والے یعنی بھاگنے والے" پس جن کو خود حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے علیحدہ کر دیا تھا اُن کا توریت کی شریعت میں کچھ حصہ نہیں رہا تھا، جیسا کہ لکھا ہے کہ وہ اسحٰق کے ساتھ نہیں پائیں گے۔ پس تعلق والوں نے انہیں چھوڑ دیا اور کسی دوسرے سے اُن کا تعلق اور رشتہ نہ تھا، اور دوسرے تمام ملکوں میں کچھ کچھ رسوم عبادات اور احکام کے پائے جاتے تھے جن سے پتہ لگتا ہے کہ کسی وقت ان کو نبیوں کی تعلیم پہنچی تھی پس صرف عرب کا ملک ہی ایک ایسا ملک تھا جو ان تعلیموں سے محض ناواقف تھا اور تمام جہان سے پیچھے رہا ہوا تھا اسلئے

آخر میں اس کی نوبت آئی اور اس کی نبوت عام ٹھہری تا کہ تمام ملکوں کو دوبارہ برکات کا حصہ دے اور جو غلطی پڑ گئی ہو اُس کو نکال دے، پس ایسی کامل کتاب کے بعد کس کتاب کا انتظار کریں جس نے سارا کام انسانی اصلاح کا اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پہلی کتابوں کی طرح صرف ایک قوم سے واسطہ نہیں رکھا بلکہ تمام قوموں کی اصلاح چاہی اور انسانی تربیت کے تمام مراتب بیان فرمائے، وحشیوں کو انسانیت کے آداب سکھائے پھر انسانی صورت بنانے کے بعد اخلاق فاضلہ کا سبق دیا۔ یہ قرآن نے ہی دنیا پر احسان کیا۔ کہ طبعی حالتوں اور اخلاق فاضلہ میں فرق کر کے دکھادیا اور جب طبعی حالتوں سے نکال کر اخلاق فاضلہ کے عالی محل تک پہنچایا تو فقط اسی پر کفایت نہ کی بلکہ اور مرحلہ جو باقی تھا۔ یعنی روحانی حالتوں کا مقام اُس تک پہنچنے کے لئے پاک معرفت کے دروازے کھول دیئے اور نہ صرف کھول دیئے بلکہ لاکھوں انسانوں کو اُس تک پہنچا بھی دیا۔ پس اس طرح پر تینوں قسم کی تعلیم جس کا میں پہلے ذکر کر آیا ہوں کمال خوبی سے بیان ہوئی۔ پس چونکہ وہ تمام تعلیموں کا جن پر دینی تربیت کی ضرورتوں کا مدار ہے۔ کامل طور پر جامع ہے، اس لئے یہ دعوے اس نے کیا کہ میں نے ہی دائرۂ دینی تعلیم کو کمال تک پہنچایا، جیسا کہ وہ ارشاد فرماتا ہے:- اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَ

رَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا" یعنی آج میں نے دین تمہارا کامل کیا اور اپنی نعمت کو تم پر پورا کر دیا اور میں تمہارا دین اسلام ٹھہرا کر خوش ہوا" یعنی دین کا انتہائی مرتبہ وہ امر ہے جو اسلام کے مفہوم میں پایا جاتا ہے یعنی یہ کہ محض خدا کے لئے ہو جانا اور اپنی نجات اپنے وجود کی قربانی سے چاہنا' نہ اور طریق سے' اور اس نیت اور ارادہ کو عملی طور پر دکھا دینا یہ وہ نقطہ ہے جس پر تمام کمالات ختم ہوتے ہیں' پس خدا کو حکیموں نے شناخت نہ کیا۔ بلکہ قرآن نے اس سچے خدا کا پتہ بتایا۔ قرآن نے خدا کی معرفت عطا کرنے کے لئے دو طریق رکھے ہیں۔ اوّل وہ طریق جس کی رُو سے انسانی عقل عقلی دلائل پیدا کرنے میں بہت قوی اور روشن ہو جاتی ہے اور غلطی کرنے سے بچ جاتی ہے' اور دوم روحانی طریق جس کو ہم "قرآن شریعت کی تیسری اصلاح" کے ذیل میں عنقریب انشاء اللہ تعالیٰ ذکر کریں گے۔" اب دیکھو کہ عقلی طور پر قرآن نے خدا کی ہستی پر کیا کیا عمدہ اور بے مثل دلائل دیئے ہیں، جیسا کہ ایک جگہ فرماتا ہے :- رَبُّنَا الَّذِیْٓ اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی یعنی خدا وہ خدا ہے جس نے ہر شئے کے مناسب حال اس کو پیدائش بخشی پھر اسی شئے کو کمالات مطلوبہ حاصل کرنے کے لئے راہ دکھا دی" اب اگر اس آیت کے مفہوم پر منظر رکھ کر انسان سے لے کر تمام بحری اور بری جانوروں

اور پرندوں کی بناوٹ تک دیکھا جائے تو خدا کی قدرت یاد
آتی ہے کہ ہر چیز کی بناوٹ اُس کے مناسب حال معلوم ہوتی ہے
پڑھنے والے خود سوچ لیں کیونکہ یہ مضمون بہت وسیع ہے۔
دوسری دلیل خدا تعالیٰ کی ہستی پر قرآن شریف
نے خدا تعالیٰ کا علت العلل ہونا قرار دیا ہے جیسا کہ وہ فرماتا ہے
وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی یعنی تمام سلسلہ علل و معلولات کا تیرے رب پر
ختم ہو جاتا ہے" تفصیل اس دلیل کی یہ ہے کہ نظر تعمق سے معلوم
ہوگا کہ یہ تمام موجودات علل و معلول کے سلسلہ میں موجود ہے اور
اسی وجہ سے دنیا میں طرح طرح کے علوم پیدا ہو گئے ہیں کیونکہ
کوئی حصہ مخلوقات کا نظام سے باہر نہیں بعض بعض کے لئے بطور
اصول اور بعض بطور فروع کے ہیں، اور یہ تو ظاہر ہے کہ علت
تو خود اپنی ذات سے قایم ہوگی اور یا اس کا وجود کسی دوسری علت
کے وجود پر منحصر ہوگا اور پھر یہ دوسری علت کسی اور علت پر
علیٰ ھٰذَا الْقِیَاسْ" اور یہ تو جائز نہیں کہ اس محدود دنیا میں
علل و معلول کا سلسلہ کہیں جا کر ختم نہ ہو اور غیر متناہی ہو تو
بضرورت ماننا پڑا کہ یہ سلسلہ ضرور کسی اخیر علت پر جا کر ختم
ہو جاتا ہے پس جس پر اس تمام سلسلہ کی انتہا ہے وہی خدا ہے
آنکھ کھول کر دیکھ لو کہ آیت وَاَنَّ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی اپنے
مختصر لفظوں میں اسی دلیل مذکورۂ بالا کو بیان فرما رہی ہے جس نے

یہ معنی ہیں کہ انتہا تمام سلسلہ کی تیرے رب تک ہے۔

تیسری دلیل اپنی ہستی پر یہ دی کہ فرماتا ہے

لَا الشَّمْسُ يَنْبَغِي لَهَا أَنْ تُدْرِكَ الْقَمَرَ وَلَا اللَّيْلُ سَابِقُ النَّهَارِ وَكُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ یعنی آفتاب چاند کو نہیں پکڑ سکتا اور نہ رات جو مظہر ماہتاب ہے دن پر جو مظہر ماہتاب ہے کچھ تسلط کر سکتی ہے یعنی ان میں سے کوئی اپنی حدود مقررہ سے باہر نہیں جاتا اگر اُن کا در پردہ کوئی مدبر نہ ہو تو یہ تمام سلسلہ درہم برہم ہو جائے، یہ دلیل ہیئت پر غور کرنے والوں کے لئے نہایت فائدہ بخش ہے کیونکہ اجرام فلکی کے اتنے بڑے عظیم الشان اور بے شمار گولے ہیں جن کے تھوڑے سے بگاڑ سے تمام دنیا تباہ ہو سکتی ہے۔ یہ کیسی قدرت حق ہے کہ وہ آپس میں نہ ٹکراتے ہیں نہ بال بھر رفتار بدلتے اور نہ اتنی مدت تک کام دینے سے کچھ گھِسے اور نہ اُن کی کلوں پرزوں میں کچھ فرق آیا، اگر سر پر کوئی محافظ نہیں تو یہ کیونکر اتنا بڑا کارخانہ بے شمار برسوں سے خود بخود چل رہا ہے۔ ان ہی حکمتوں کی طرف اشارا کر کے خدا تعالیٰ دوسرے مقام پر فرماتا ہے۔ أَفِي اللَّهِ شَكٌّ فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ یعنی کیا خدا کے وجود میں شک ہو سکتا ہے جس نے ایسے آسمان

اور ایسی زمین بنائی۔

چوتھی لطیف دلیل اپنی ہستی پر فرماتا ہے۔ كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّ يَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ

یعنی ہر چیز معرض زوال میں ہے اور جو باقی رہنے والا ہے وہ خدا ہے جو جلال اور بزرگی والا ہے" اب دیکھو کہ اگر ہم فرض کرلیں کہ ایسا ہو کہ زمین ذرہ ذرہ ہوجائے اوراجرام فلکی بھی ٹکرے ٹکرے ہو جائیں اور اُن پر معدوم کرنے والی ایک ایسی ہوا چلے جو تمام نشان ان چیزوں کے مٹادے گر پھر بھی عقل اس بات کو مانتی اور قبول کرتی ہے بلکہ صحیح کانشنس اس کو ضروری سمجھتا ہے کہ اس تمام میستی کے بعد ایک چیز باقی رہ جائے جس پر فنا طاری نہ ہو اور تبدل و تغیر کو قبول نہ کرے اور اپنی پہلی حالت پر باقی رہے پس وہی خدا ہے جو تمام فانی صورتوں کو ظہور میں لایا"

پانچویں دلیل اپنی ہستی پر قرآن شریف میں پیش فرماتا ہے۔ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى یعنی میں نے روحوں کو کہا کہ "کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں اُنھوں نے کہا" کیوں نہیں" اِس آیت میں خدا تعالیٰ قصہ کے رنگ میں رُوحوں کی اِس خاصیت

بیان فرماتا ہے جو اُن کی فطرت میں اُس نے رکھی ہے اور وہ یہ ہے
کہ کوئی روح فطرت کی رُو سے خدا تعالیٰ کا انکار نہیں کر سکتی، صرف
منکروں کو اپنے خیال میں دلیل نہ ملنے کی وجہ سے انکار ہے مگر
باوجود اِس انکار کے وہ اِس بات کو مانتے ہیں کہ ہر ایک حادثے
کے واسطے ضرور ایک محدث ہے دنیا میں ایسا کوئی نادان نہیں
کہ اگر مثلاً بدن میں کوئی بیماری ظاہر ہو تو وہ اس بات پر اصرار
کرے کہ در پردہ اس بیماری کے ظہور کی کوئی علت نہیں اگر یہ
سلسلہ دنیا کا علل اور معلول سے مربوط نہ ہوتا تو قبل از وقت یہ
بتا دینا کہ فلاں تاریخ طوفان آئے گا یا آندھی یا خسوف ہوگا یا کسوف
ہوگا۔ یا فلاں وقت بیمار مرجائیگا یا فلاں وقت تک ایک بیماری کیساتھ فلاں بیماری
لاحق ہوجائیگی، یہ تمام باتیں غیر ممکن ہو جاتیں، پس ایسا محقق اگرچہ
خدا کے وجود کا اقرار نہیں کرتا مگر ایک طور سے تو اُس نے اقرار
کر ہی لیا کہ وہ بھی ہماری طرح معلولات کے لئے علل کی تلاش میں
ہے پس یہ بھی ایک قسم کا اقرار ہے اگرچہ کامل اقرار نہیں، ماسوا
اس کے اگر کسی ترکیب سے ایک منکر وجود باری تعالیٰ کو ایسے
طور سے بیہوش کیا جائے کہ وہ اس سفلی زندگی کے خیالات سے
بالکل علیحدہ ہو کر اور تمام ارادوں سے معطل رہ کر اعلیٰ ہستی کے
قبضہ میں ہو جائے تو وہ اِس صورت میں خدا کے وجود کا اقرار
کرے گا انکار نہیں کرے گا جیسا کہ اس پر بڑے بڑے مجربین کے

تجربہ ہے سو ایسی حالت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے اور مطلب آیت یہ ہے کہ انکار وجودِ باری صرف سفلی زندگی تک ہے ورنہ اصل فطرت میں اقرار بھرا ہوا ہے۔

یہ پانچ دلائل وجودِ باری تعالیٰ ہم نے بطور نمونہ لکھے ہیں۔

پھر اس کے بعد یہ بھی جاننا چاہیئے کہ جس خدا کی طرف ہمیں قرآن شریف نے بلایا ہے اس کی اس نے یہ صفات لکھی ہیں هُوَ اللّٰهُ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ عَالِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهَادَةِ هُوَ الرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلَامُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ وَ هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ اَللّٰهُ الصَّمَدُ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ یعنی وہ خدا جو واحد لاشریک ہے جس کے سوا کوئی بھی پرستش اور فرماں برداری کے لائق نہیں، یہ اس لئے فرمایا کہ اگر وہ لاشریک نہ ہو تو شاید اس کی طاقت پر دشمن کی طاقت غالب آجائے اس

صورت میں خدائی معرضِ خطر میں رہے گی اور یہ جو فرمایا
کہ اس کے سوا کوئی پرستش کے لائق نہیں اس سے یہ مطلب
ہے کہ وہ ایسا کامل خدا ہے جس کی صفات اور خوبیاں اور
کمالات ایسے اعلیٰ اور بلند ہیں کہ اگر موجودات میں سے بوجہ
صفاتِ کاملہ کے ایک خدا انتخاب کرنا چاہیں یا دل سے عمدہ
سے عمدہ اور اعلیٰ سے اعلیٰ خدا کی صفات فرض کریں تو وہ
سب سے اعلیٰ جس سے بڑھ کر کوئی اعلیٰ نہیں ہو سکتا وہی خدا
ہے۔ جس کی پرستش میں ادنیٰ کو شریک کرنا ظلم ہے۔" پھر فرمایا
کہ "عالم الغیب" ہے یعنی اپنی ذات کو آپ ہی جانتا ہے اس کی
ذات پر کوئی احاطہ نہیں کر سکتا، ہم آفتاب اور ماہتاب اور
ہر مخلوق کا سراپا دیکھ سکتے ہیں مگر خدا کا سراپا دیکھنے سے
قاصر ہیں۔" پھر فرمایا کہ وہ "عالم الشہادۃ" ہے یعنی کوئی چیز
اس کی نظر سے پردہ میں نہیں ہے، یہ جائز نہیں کہ وہ خدا
کہلا کر پھر علم اشیاء سے غافل ہو وہ اس عالم کے ذرہ ذرہ پر
اپنی نظر رکھتا ہے۔ لیکن انسان نہیں رکھ سکتا وہ جانتا ہے کہ کب
اس نظام کو توڑ دے گا اور قیامت برپا کر دیگا اور اس کے سوا
کوئی نہیں جانتا کہ ایسا کب ہوگا۔ سو وہی خدا ہے جو ان تمام
وقتوں کو جانتا ہے۔" پھر فرمایا کہ ھُوَ الرَّحمٰن یعنی وہ جانداروں کی
ہستی اور ان کے اعمال سے پہلے محض اپنے لطف سے نہ کسی کے

عمل کی پاداش میں اُن کے لئے سامانِ راحت میسر کرتا ہے جیسا آفتاب اور زمین اور دوسری تمام چیزوں کو ہمارے وجود اور ہمارے اعمال کے وجود سے پہلے ہمارے لئے بنادیا اس عطیہ کا نام خدا کی کتاب میں رحمانیت ہے اور اس کام کے لحاظ سے خدا رحمٰن کہلاتا ہے" پھر فرمایا اَلرَّحِیْمُ یعنی وہ خدا نیک عملوں کی نیک تر جزا دیتا ہے کسی کی محنت کو ضائع نہیں کرتا اور اس کام کے لحاظ سے رحیم کہلاتا ہے اور یہ صفت رحیمیت کے نام سے موسوم ہے۔

اور پھر فرمایا کہ اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ یعنی وہ خدا بادشاہ ہے جس پر کوئی داغ عیب نہیں، یہ ظاہر ہے کہ انسانی بادشاہت عیب سے خالی نہیں، مثلاً اگر تمام رعیت جلا وطن ہوکر دوسرے ملک کی طرف بھاگ جائے تو پھر بادشاہی قائم نہیں رہ سکتی یا اگر تمام رعیت محطوظ ہوجائے تو پھر خراج شاہی کہاں سے آئے اور اگر رعیت کے لوگ اس سے بحث شروع کردیں کہ تجھ میں ہم سے زیادہ کیا ہے؟ تو وہ کون سی لیاقت اپنی ثابت کرے، پس خدا تعالیٰ کی بادشاہی ایسی نہیں ہے وہ ایک دم میں تمام ملک کو فنا کرکے اور مخلوقات پیدا کرسکتا ہے اگر وہ ایسا خالق اور قادر نہ ہوتا تو بجز ظلم کے اس کی بادشاہت چل نہ سکتی کیونکہ وہ دنیا کو ایک مرتبہ

معافی اور نجات دیکر پھر دوسری دنیا کہاں سے لاتا؟ کیا نجات یافتہ لوگوں کو دنیا میں بھیجنے کے لئے پھر پکڑتا اور ظلم کی راہ سے اپنی معافی اور نجات دہی کو واپس لے لیتا۔ تو اس صورت میں اس کی خدائی میں فرق آتا اور دنیا کے بادشاہوں کی طرح ایک داغدار بادشاہ ہوتا جو دنیا کے لئے قانون بناتے ہیں بات بات میں بگڑتے ہیں اور اپنی خود غرضی کے وقتوں میں جب دیکھتے ہیں کہ ظلم کے بغیر چارہ نہیں تو ظلم کو شیر مادر سمجھ لیتے ہیں، مثلاً قانون شاہی جائز رکھتا ہے کہ ایک جہاز بچانے کیلئے ایک کشتی کے سواروں کو تباہی میں ڈال دیا جائے اور ہلاک کر دیا جائے مگر خدا کو تو یہ اضطرار پیش نہیں آنا چاہیئے پس اگر خدا پورا قادر اور عدم سے پیدا کرنے والا نہ ہوتا تو وہ یا تو کمزور بادشاہوں کی طرح قدرت کی جگہ ظلم سے کام لیتا اور یا عادل بن کر خدائی کو الوداع کہتا بلکہ خدا کا جہاز تمام قدرتوں کے ساتھ سچے انصاف پر چل رہا ہے" پھر فرمایا اَلسَّلَامُ یعنی وہ خدا جو تمام عیبوں اور مصائب اور سختیوں سے محفوظ ہے بلکہ سلامتی دینے والا ہے اس کے معنی بھی ظاہر ہیں کیونکہ اگر وہ آپ ہی مصیبتوں میں پڑتا لوگوں کے ہاتھ سے مارا جاتا اور اپنے ارادوں میں ناکام رہتا

تو پھر اس بدنمونہ کو دیکھکر دل کس طرح تسلی پکڑتے کہ ایسا خدا
ہمیں ضرور مصیبتوں سے چھڑا دے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ باطل
معبودوں کے بارے میں فرماتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ وَاِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ
شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ مَا
قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (الجزو نمبر ۱۷ سورۃ حج)
یعنی جن لوگوں کو تم معبود بنائے بیٹھے ہو وہ تو ایسے ہیں کہ اگر
سب مل کر ایک مکھی پیدا کرنا چاہیں تو کبھی پیدا نہ کرسکیں اگرچہ
ایک دوسرے کی مدد بھی کریں، بلکہ اگر مکھی کوئی اُن کی چیز چھین کر
لے جائے تو اُنھیں طاقت نہیں ہوگی کہ وہ مکھی سے چیز واپس
لے سکیں اُن کے پرستار عقل کے کمزور اور وہ طاقت کے کمزور ہیں
کیا خدا ایسے ہوا کرتے ہیں! خدا تو وہ ہے کہ سب قوتوں والوں
سے زیادہ قوت والا اور سب پر غالب آنے والا ہے نہ اُس کو
کوئی پکڑ سکے نہ مار سکے، ایسی غلطیوں میں جو لوگ پڑتے ہیں وہ
خدا کی قدر نہیں پہچانتے اور نہیں جانتے کہ خدا کیسا ہونا چاہیئے"
اور پھر فرمایا اَلْمُؤْمِنُ خدا امن بخشنے والا اور اپنے کمالات اور
توحید پر دلائل قائم کرنے والا ہے یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے
کہ سچے خدا کا ماننے والا کسی مجلس میں شرمندہ نہیں ہوسکتا اور
اور نہ خدا کے سامنے شرمندہ ہوگا۔ کیونکہ اس کے پاس

زبردست دلائل ہوتے ہیں لیکن بناوٹی خدا کا ماننے والا بڑی مصیبت میں ہوتا ہے۔ وہ بجائے دلائل بیان کرنے کے ہر ایک بیہودہ بات کو راز میں داخل کرتا ہے تاکہ ہنسی نہ ہو اور ثابت شدہ غلطیوں کو چھپانا چاہتا ہے" اور پھر فرمایا کہ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ یعنی وہ سب کا محافظ اور سب پر غالب اور بگڑے ہوئے کاموں کا بنانے والا ہے اور اُس کی ذات نہایت ہی مستغنی ہے۔

اور فرمایا کہ هُوَ اللَّهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ لَهُ الْأَسْمَاءُ الْحُسْنَىٰ یعنی وہ ایسا خدا ہے کہ جسموں کا بھی پیدا کرنے والا اور روحوں کا بھی پیدا کرنے والا رحم میں تصویر کھینچنے والا تمام نیک نام جہاں تک خیال میں آسکیں سب اُسی کے نام ہیں" اور پھر فرمایا یُسَبِّحُ لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ وَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ یعنی آسمان کے لوگ بھی اُس کے نام کو پاکی سے یاد کرتے ہیں اور زمین کے لوگ بھی" اس آیت میں اشارہ فرمایا ہے کہ آسمانی اجرام میں آبادی ہے اور وہ لوگ بھی خدا کی ہدایتوں کے پابند ہیں" اور پھر فرمایا عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ یعنی خدا بڑا قادر ہے" یہ پرستاروں کے لئے تسلی ہے کیونکہ اگر خدا عاجز ہو اور قادر نہ ہو تو ایسے خدا سے کیا امید رکھیں" اور پھر فرمایا رَبِّ الْعَالَمِينَ الرَّحْمَٰنِ الرَّحِيمِ مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ

اِذا دعانِ یعنی وہی خدا ہے جو تمام عالموں کی پرورش کرنیوالا رحمٰن رحیم اور جزا کے دن کا آپ مالک ہے۔ اس اختیار کو کسی کے ہاتھ میں نہیں دیا اور ہر ایک پکارنے والے کی پکار کو سُننے والا یعنی دعاؤں کا قبول کرنے والا، اور پھر فرمایا اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ یعنی ہمیشہ رہنے والا اور تمام جانوں کی جان اور سب کے وجود کا سہارا، یہ اس لئے کہا کہ اگر وہ ازلی ابدی نہ ہو تو اس کی زندگی کے بارے میں بھی دھڑکا رہیگا کہ شاید ہم سے پہلے فوت نہ ہو جائے، اور پھر فرمایا کہ وہ خدا اکیلا خدا ہے۔ وہ بے نیاز ہے نہ وہ کسی کا بیٹا اور نہ کوئی اس کا بیٹا اور نہ کوئی اس کے برابر اور نہ کوئی اس کے برابر اور نہ کوئی اس کا ہم جنس"۔

یاد رہے کہ خدا تعالیٰ کی توحید کو صحیح طور پر ماننا اور اس میں زیادتی یا کمی نہ کرنا یہ وہ عدل ہے جو انسان اپنے مالک حقیقی کے حق میں بجا لاتا ہے، یہ تمام حصہ اخلاقی تعلیم کا ہے جو قرآن شریف کی تعلیم میں سے درج کیا گیا ہے، اس میں یہ اصول ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمام اخلاق کو افراط اور تفریط سے بچایا ہے اور ہر ایک خلق کو اس حالت میں خلق کے نام سے موسوم کیا ہے کہ جب اپنی واقعی اور واجب حد سے کم و بیش نہ ہو، یہ تو ظاہر ہے کہ نیکی حقیقی وہی چیز ہے جو دو حدوں کے وسط میں ہوتی ہے یعنی زیادتی اور کمی یا افراط و تفریط کے درمیان

ہوتی ہے، ہر ایک عادت جو وسط کی طرف کھینچے اور وسط پر قایم کرے وہی خُلقِ فاضل کو پیدا کرتی ہے۔ محل اور موقع کا پہچاننا ایک وسط ہے مثلاً اگر زمیندار اپنا تخم وقت سے پہلے بووے یا وقت کے بعد بوئے دونوں صورتوں میں وہ وسط کو چھوڑتا ہے نیکی اور حق اور حکمت سب وسط میں ہے اور وسط موقع بینی میں یا یوں سمجھو کہ حق وہ چیز ہے کہ ہمیشہ دو متقابل باطلوں کے وسط میں ہوتا ہے اور اس میں کچھ شک نہیں کہ عین موقع کا التزام ہمیشہ انسان کو وسط میں رکھتا ہے اور خداشناسی کے بارے میں وسط کی شناخت یہ ہے کہ خدا کی صفات بیان کرنے میں نہ تو نفی صفات کے پہلو کی طرف جھک جائے اور نہ خدا کو جسمانی چیزوں کا مشابہ قرار دے یہی طریق قرآن شریف نے صفات باری تعالٰی میں اختیار کیا ہے، چنانچہ وہ یہ بھی فرماتا ہے کہ خدا دیکھتا سنتا جانتا بولتا کلام کرتا ہے اور پھر مخلوق کی مشابہت سے بچانے کے لئے یہ بھی فرماتا ہے کہ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ فَلَا تَضْرِبُوْا لِلّٰهِ الْاَمْثَالَ یعنی خدا کی ذات اور صفات میں کوئی اس کا شریک نہیں اس کیلئے مخلوق سے مثالیں مت دو سو خدا کی ذات تشبیہ اور تنزیہہ کے بین بین رکھنا یہی وسط ہے غرض اسلام کی تعلیم میانہ روی کی تعلیم ہے سُوْرَۃ فَاتِحَۃ بھی میانہ روی کی ہدایت فرماتی ہے کیونکہ فرماتا ہے غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ مغضوب علیہم سے وہ لوگ مراد ہیں جو

خدا تعالیٰ کے مقابل پر قوت غضبی کو استعمال کر کے قوائے سبعیہ کی پیروی کرتے ہیں اور ضالین سے وہ مراد ہیں جو قوائے بہیمیہ کی پیروی کرتے ہیں اور میانہ طریق وہ ہے جس کو لفظ اَنْعَمْتَ عَلَیْہِمْ سے یاد فرمایا ہے، غرض اس مبارک امت کے لئے قرآن شریف میں وسط کی ہدایت ہے، توریت میں خدا تعالیٰ نے انتقامی امور پر زور دیا تھا اور انجیل میں عفو اور درگذر پر زور دیا تھا، اور اس امت کو موقع شناسی اور وسط کی تعلیم ملی، چنانچہ اللہ تعالےٰ فرماتا ہے۔ وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا یعنی ہم نے تم کو وسط پر عمل کرنے والا بنایا اور وسط کی تعلیم تمہیں دی، سو مبارک وہ جو وسط پر چلتے ہیں خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُھَا۔"

قرآن شریف کی تعلیم فرمودہ تیسری اصلاح

جس میں رُوحانی حالتیں بیان کی گئی ہیں۔ واضح رہے کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ بموجب ہدایت قرآن شریف کے روحانی حالتوں کا منبع اور سرچشمہ نفس مطمئنہ ہے جو انسان کو با اخلاق ہونے کے مرتبہ سے با خدا ہونے کے مرتبہ تک پہنچاتا ہے۔ جیسا کہ اللہ جلّ شانہٗ فرماتا ہے کہ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ۔

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ یعنی اے نفس خدا کے ساتھ آرام یافتہ اپنے رب کی طرف واپس چلا آ وہ تجھ سے راضی اور تو اُس سے راضی۔ پس میرے بندوں میں داخل ہو جا اور میری بہشت کے اندر آ، اس جگہ بہتر ہے کہ ہم روحانی حالتوں کے بیان کرنے کے لئے اس آیتِ کریمہ کی تفسیر کسی قدر توضیح سے بیان کریں؛ پس یاد رکھنا چاہیئے کہ اعلیٰ درجہ کی روحانی حالت انسان کی اس دنیوی زندگی میں یہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے ساتھ آرام پا جائے اور تمام اطمینان اور سرور اور لذت اس کی خدا میں ہی ہو جائے، یہی وہ حالت ہے جس کو دوسرے لفظوں میں بہشتی زندگی کہا جاتا ہے اس حالت میں انسان اپنے کامل صدق و صفا اور وفا کے بدلہ میں ایک نقد بہشت پا لیتا ہے۔ یعنی دوسرے لوگوں کی نظر بہشتِ موعود پر ہوتی ہے اور یہ بہشت موجود میں داخل ہوتا ہے اسی درجہ پر پہنچکر انسان سمجھتا ہے کہ وہ عبادت جس کا بوجھ اس کے سر پر ڈالا گیا ہے درحقیقت وہی ایک ایسی غذا ہے جس سے اُس کی روح نشوونما پاتی ہے اور جس پر اُس کی رُوحانی زندگی کا بڑا بھاری مدار ہے اور اُس کے نتیجہ کا حصول کسی دوسرے

جہاں پر موقوف نہیں ہے اسی مقام پر یہ بات حاصل ہوتی ہے کہ وہ ہماری ملامتیں جو نفس لوامہ انسان کو اس کی ملکی زندگی پر کرتا ہے اور پھر بھی نیک خواہشوں کو اچھی طرح ابھار نہیں سکتا۔ اور بری خواہشوں سے حقیقی نفرت نہیں دلاسکتا اور نہ نیکی پر ٹھہرنے کی پوری قوت بخش سکتا ہے، اب اس درجہ پر وقت آجاتا ہے کہ پوری کامیابی حاصل کرے اب تمام نفسانی جذبات خود بخود افسردہ ہونے لگتے ہیں اور روح پر ایک ایسی طاقت افزا ہوا چلنے لگتی ہے جس سے انسان پہلی کمزوریوں کو ندامت کی نظر سے دیکھتا ہے اس وقت انسانی سرشت پر ایک بھاری انقلاب آتا ہے جو عادات میں تبدلِ عظیم پیدا کر دیتا ہے اور انسان اپنی پہلی حالتوں سے بہت دور جا پڑتا ہے، دھویا جاتا ہے اور صاف کیا جاتا ہے اور خدا نیکی کی محبت کو اپنے ہاتھ سے اس کے دل میں لکھ دیتا ہے اور بدی کا گند اپنے ہاتھ سے اس کے دل سے باہر پھینک دیتا ہے، سچائی کی فوج سب کی سب دل کے شہرستان میں آجاتی ہے اور فطرت کے تمام برجوں پر راست بازی کا قبضہ ہو جاتا ہے اور حق کی فتح ہوتی ہے۔ اور باطل بھاگ جاتا ہے اور اپنے ہتیار پھینک دیتا ہے اس شخص کے دل پر خدا کا ہاتھ ہوتا ہے اور ہر قدم پر خدا کے زیرِ سایہ چلتا ہے چنانچہ خدا تعالیٰ آیاتِ ذیل میں ان ہی امور کی

اشارا فرمایا ہے۔ أُوْلَٰئِكَ كَتَبَ فِي قُلُوبِهِمُ الْإِيمَانَ وَأَيَّدَهُم بِرُوحٍ مِّنْهُ ۔۔۔ وَزَيَّنَهُ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ إِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوقَ وَالْعِصْيَانَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الرَّاشِدُونَ ۝ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَنِعْمَةً ۚ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ۝ جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوقًا یعنی خدا نے مومنوں کے دل میں ایمان کو اپنے ہاتھ سے لکھدیا ہے اور روح القدس کے ساتھ اُن کی مدد کی، اُس نے اے مومنو ایمان کو تمھارا محبوب بنادیا اور اُس کا حسن و جمال تمھارے دل میں بٹھادیا اور کفر و بدکاری اور معصیت سے تمھارے دل کو نفرت دے دی اور بری راہوں کا مکروہ ہونا تمھارے دل میں جمادیا یہ سب کچھ خدا کے فضل و رحمت سے ہوا" حق آیا اور باطل بھاگ گیا اور باطل کب حق کے مقابل ٹھہر سکتا تھا" غرض یہ تمام اشارات اُس روحانی حالت کی طرف ہیں جو تیسرے درجہ پر انسان کو حاصل ہوتی ہے اور سچی بینائی انسان کو نہیں ملسکتی جب تک یہ حالت اُس کو حاصل نہ ہو، اور یہ جو خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے ایمان اُن کے دل میں اپنے ہاتھ سے لکھا اور روح القدس سے اُن کی مدد کی، یہ اس طرف اشارا ہے کہ انسان کو سچی طہارت اور پاکیزگی حاصل نہیں ہوسکتی جب تک آسمانی مدد اُس کے شامل حال نہ ہو۔ نفس لوّامہ کے مرتبہ پر انسان کا یہ حال ہوتا ہے کہ بار بار

توبہ کرتا ہے اور بار بار گرتا ہے بلکہ بسا اوقات اپنی صلاحیت سے ناامید ہو جاتا ہے اور اپنے مرض کو ناقابلِ علاج سمجھ لیتا ہے اور ایک مدت تک ایسا ہی رہتا ہے اور پھر جب وقت مقدر پورا ہو جاتا ہے تو رات میں یا دن میں ایک دفعہ ایک نور اس پر نازل ہوتا ہے اور اس نور میں الٰہی قوت ہوتی ہے جس نور کے نازل ہونے کے ساتھ ہی ایک عجیب تبدیلی اس کے اندر پیدا ہو جاتی ہے اور غیبی ہاتھ کا ایک قوی تصرف محسوس ہوتا ہے اور ایک عجیب عالم سامنے آجاتا ہے، اُس وقت انسان کو پتہ لگتا ہے کہ خدا ہے اور آنکھوں میں وہ نور آجاتا ہے جو پہلے نہیں تھا، لیکن اس راہ کو کیونکر حاصل کریں اور اس روشنی کو کس طرح پائیں؛ سو جاننا چاہیئے کہ اس دنیا میں جو دارالاسباب ہے ہر ایک معلول کے لئے ایک علت ہے اور ہر حرکت کے لئے ایک محرک ہے اور ہر علم حاصل کرنے کے لئے ایک راہ ہے جس کو صراطِ مستقیم کہتے ہیں، دنیا میں ایسی کوئی چیز نہیں جو بغیر پابندی اِن قواعد کے مل سکے جو قدرت نے ابتداء سے اُس کے لئے مقرر کر رکھے ہیں، قانونِ قدرت بتا رہا ہے کہ ہر چیز کے حصول کے لئے ایک صراطِ مستقیم ہے اور اُس کا حصول قدرتاً اسی پر موقوف ہے مثلاً اگر ہم ایک اندھیری کوٹھری میں بیٹھے ہوں اور آفتاب کی روشنی کی ضرورت ہو

تو ہمارے لئے یہ صراطِ مستقیم ہے کہ ہم اس کھڑکی کو کھول دیں جو آفتاب کی طرف ہے۔ تب ایک دفعہ آفتاب کی روشنی اندر آکر ہمیں منور کردے گی۔ سو ظاہر ہے کہ اسی طرح خدا کے سچے اور واقعی فیوض کے پانے کے لئے بھی کوئی کھڑکی ہوگی۔ اور پاک روحانیت کے حاصل کرنے کے لئے کوئی خاص طریق ہوگا اور وہ یہ ہے کہ روحانی امور کے لئے صراطِ مستقیم کی تلاش کریں، جیسا کہ ہم اپنی زندگی کے تمام اُمور میں اپنی کامیابیوں کے لئے صراطِ مستقیم کی تلاش کرتے رہتے ہیں، مگر کیا وہ یہ طریق ہے کہ ہم صرف اپنی ہی عقل کے زور سے اور اپنی ہی تراشیدہ باتوں سے خدا کے وصال کو ڈھونڈیں کیا محض ہماری ہی اپنی منطق اور فلسفہ سے اس کے وہ دروازے ہم پر کھلتے ہیں۔ جن کا کھلنا اس کے قوی ہاتھ پر موقوف ہے، یقیناً سمجھو کہ یہ بالکل صحیح نہیں ہم اس حیّ و قیّوم کو محض اپنی تدبیروں سے ہرگز نہیں پاسکتے بلکہ اس راہ میں صراطِ مستقیم صرف یہ ہے کہ

پہلے ہم اپنی زندگی مع اپنی تمام قوتوں کے خدا تعالیٰ کی راہ میں وقف کرکے پھر خدا کے وصال کے لئے دُعا میں لگے رہیں تاکہ خدا کو خدا ہی کے ذریعہ سے پائیں

اور سب سے زیادہ پیاری دُعا جو عین محل اور موقع سوال کا ہمیں سکھاتی ہے اور فطرت کے رُوحانی جوش کا نقشہ ہمارے سامنے رکھتی ہے وہ دعا ہے جو خدائے کریم نے اپنی پاک کتاب قرآن شریف میں یعنی سورۂ فاتحہ میں ہمیں سکھائی ہے۔ اور وہ یہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ	تمام پاک تعریفیں جو ہو سکتی ہیں اُس اللہ کے لئے ہیں جو تمام جہانوں کا پیدا کرنیوالا اور قایم رکھنے والا ہے
اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ	وہ خدا جو ہمارے اعمال سے پہلے ہمارے لئے رحمت کا سامان میسر کرنے والا ہے اور ہمارے اعمال کے بعد رحمت کے ساتھ جزا دینے والا ہے،
مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ	وہ خدا جو جزا کے دن کا وہی ایک مالک ہے کسی اور کو وہ دن نہیں سونپا گیا ہے۔
اِیَّاکَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ	اے وہ جو ان تعریفوں کا جامع ہے ہم تیری ہی پرستش کرتے ہیں اور ہر کام میں تجھ ہی سے توفیق چاہتے ہیں

اس جگہ ہم کے لفظ سے پرستش کا اقرار کرنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ہمارے تمام قویٰ تیری پرستش میں لگے ہوئے ہیں۔ اور تیرے آستانہ پر جھکے ہوئے ہیں کیونکہ انسان باعتبار اپنے اندرونی قویٰ کے ایک جماعت اور ایک امّت ہے اور اس طرح پر

تمام قویٰ کا خدا کو سجدہ کرنا وہ حالت ہے جس کو اسلام کہتے ہیں۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ — ہمیں اپنی سیدھی راہ دکھا اور اُس پر ثابت قدم کر کے اُن لوگوں کی راہ دکھا جن پر تیرا انعام و اکرام ہے اور جو تیرے مورد فضل و کرم ہو گئے ہیں!

غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ — ہمیں اُن لوگوں کی راہوں سے بچا جن پر تیرا غضب ہے اور جو تجھ تک نہیں پہنچ سکے اور راہ کو بھول گئے۔

آمین — اے خدا ایسا ہی کر!

یہ آیات سمجھا رہی ہیں کہ خدا تعالیٰ کے انعامات جو دوسرے الفاظ میں فیوض کہلاتے ہیں اُن ہی پر نازل ہوتے ہیں جو اپنی زندگی کی قربانی خدا کی راہ میں [illegible] اور اپنا تمام وجود اُس کی راہ میں وقف کر کے اور اُس کی رضا میں محو ہو کر پھر اس وجہ سے دعا میں لگے رہتے ہیں کہ جو کچھ انسان کو روحانی [illegible] اور خدا کے قرب اور وصال اور اُس کے مکالمات [illegible] میں سے ممکن ہے وہ سب اُن کو ملے اور اس دعا کے ساتھ اپنے تمام قویٰ سے [illegible] بجا لاتے ہیں اور گناہ سے [illegible] اور آستانہ الٰہی پر پڑے رہتے ہیں اور جہاں تک اُن سے ممکن ہے اپنے تئیں بدی سے بچاتے ہیں اور غضبِ الٰہی کی راہوں سے دور رہتے ہیں سو چونکہ وہ اعلیٰ ہمت اور صدق کے ساتھ خدا کو ڈھونڈتے ہیں

اس لئے اُس کو پا لیتے ہیں اور خدا تعالیٰ کی پاک معرفت کے پیالوں سے سیراب کئے جاتے ہیں، اُس آیت میں جو استقامت کا ذکر فرمایا یہ اِس بات کی طرف اشارا ہے کہ سچا اور کامل فیض جو روحانی عالم تک پہنچاتا ہے کامل استقامت سے وابستہ ہے اور کامل استقامت سے مُراد ایسی حالتِ صدق و صفا ہے جس کو کوئی امتحان ضرر نہ پہنچا سکے یعنی ایسا پیوند ہو جس کو نہ تلوار کاٹ سکے نہ آگ جلا سکے اور نہ کوئی دوسری آفت نقصان پہنچا سکے۔ عزیزوں کی موتیں اُس سے علیحدہ نہ کر سکیں پیاروں کی جُدائی اُس میں خلل انداز نہ ہو سکے بے آبروئی کا خوف کچھ رُعب نہ ڈال سکے۔ ہولناک دُکھوں سے مارا جانا دل کو ایک ذرہ نہ ڈرا سکے، سو یہ دروازہ نہایت تنگ ہے اور یہ راہ نہایت دشوار گزار ہے کس قدر مشکل ہے آہ صد آہ۔ اسی کی طرف اللہ جل شانہ اِن آیات میں اشارہ فرماتا ہے:۔ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ یعنی اِن کو کہہ دے کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں۔ اور تمہاری برادری اور تمہارے وہ مال جو تم نے محنت سے کمائے ہیں اور تمہاری سوداگری جس کے بند ہونے کا تمہیں خوف ہے۔ اور

تمہاری حویلیاں جو تمہاری دل پسند ہیں خدا سے اور اُس کے رسول سے اور خدا کی راہ میں اپنی جانوں کو لڑانے سے زیادہ پیارے ہیں تو تم اُس وقت تک منتظر رہو کہ جب تک خدا اپنا حکم ظاہر کرے۔ اور خدا بدکاروں کو اپنی راہ کبھی نہیں دکھائے گا۔" اِن آیات سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ جو لوگ خدا کی مرضی کو چھوڑ کر اپنے عزیزوں اور اپنے مالوں سے پیار کرتے ہیں وہ خدا کی نظر میں بدکار ہیں وہ ضرور ہلاک ہوں گے کیونکہ اُنہوں نے غیر کو خدا پر مقدم رکھا۔ یہی وہ تیسرا مرتبہ ہے جس میں وہ شخص باخدا بنتا ہے جو اُس کے لئے ہزاروں بلائیں خرید لے اور خُدا کی طرف ایسے صدق اور اخلاص سے جُھک جائے کہ خدا کے سوا اس کا کوئی نہ رہے گویا سب مر گئے۔" پس سچ تو یہ ہے کہ جب تک ہم خود نہ مریں۔ زندہ خدا نظر نہیں آسکتا خدا کے ظہور کا وہی دن ہوتا ہے کہ جب ہماری جسمانی زندگی پر موت آئے، ہم اندھے ہیں جب تک غیر کے دیکھنے سے اندھے نہ ہو جائیں، ہم مُردہ ہیں جب تک

ہمارے ہاتھ [illegible] نہ ہو جائیں۔ جب ہمارا منہ ٹھیک
ٹھیک اُس ۔ [illegible] پڑے گا تب واقعی استقامت جو
تمام نفسانی جذبات پر غالب آتی ہے ہمیں حاصل ہوگی اس سے
پہلے نہیں، اور یہی وہ استقامت ہے جس سے نفسانی زندگی پر
موت آجاتی [illegible] استقامت یہ ہے کہ جیسا وہ فرماتا ہے
بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ یعنی یہ کہ قربانی کی طرح
[illegible] آگے گردن رکھ دو، ایسا ہی ہم اس وقت درجۂ استقامت
حاصل کریں گے جب ہمارے وجود کے تمام ذرے اور ہمارے
نفس کی تمام قوتیں اُس کے کام میں لگ جائیں اور ہماری
زندگی اُسی کے لئے ہو جائے، جیسا کہ وہ فرماتا ہے:- قُلْ اِنَّ
صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یعنی کہہ کہ میری
نماز اور قربانی اور میرا زندہ رہنا اور میرا مرنا سب خدا کے لئے ہے،
جب انسان کی محبت خدا کے ساتھ اس درجہ تک پہنچ جائے کہ
اس کا مرنا اور جینا اپنے لئے نہیں بلکہ خدا ہی کے لئے ہو جائے
تب وہ خدا جو ہمیشہ سے پیار کرنے والوں کے ساتھ پیار کرتا آیا
ہے اپنی محبت کو اُس پر اُتارتا ہے اور اُن دونوں محبتوں کے
ملنے سے انسان کے اندر ایک نور پیدا ہوتا ہے جس کو دنیا نہیں
پہچانتی ہے اور نہ سمجھ سکتی ہے، ہزاروں صدیقوں اور برگزیدوں کا

خون اسی لئے ہوا ہے کہ دنیا نے اُن کو نہیں پہچانا وہ اسی لئے مکار اور خودغرض کہلائے کہ دنیا اُن کے نورانی چہرے کو دیکھ نہ سکی، جیسا کہ فرماتا ہے:۔ يَنْظُرُونَ اِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُوْنَ یعنی وہ جو منکر ہیں تیری طرف دیکھتے تو ہیں مگر تو اُن کو نظر نہیں آتا، غرض وہ نور جب پیدا ہو جاتا ہے تو اس نور کی پیدائش سے ایک زمینی شخص آسمانی شخص ہو جاتا ہے وہ جو ہر وجود کا مالک ہے اُس کے اندر بولتا ہے اور اپنی الوہیت کی چمکیں دکھاتا ہے اور اُس کے دل کو جو پاک محبت سے بھرا ہوا ہے اپنا تخت گاہ بناتا ہے اور جب ہی سے کہ یہ شخص ایک نورانی تبدیلی پاکر ایک نیا آدمی ہو جاتا ہے وہ اس کے لئے ایک نیا خدا ہو جاتا ہے اور نئی عادتیں اور نئی سنتیں ظہور میں لاتا ہے یہ نہیں کہ وہ نیا خدا ہے یا عادتیں نئی ہیں، مگر عام عادتوں سے وہ عادتیں الگ ہوتی ہیں۔ جن سے دنیا کا فلسفہ آشنا نہیں اور یہ شخص جیسا کہ اللہ جل شانہٗ نے فرمایا ہے وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ۔ یعنی انسانوں میں سے وہ اعلیٰ درجہ کے انسان ہیں جو خدا کی مرضی میں کھوئے ہوئے ہیں وہ اپنی جان بیچتے ہیں اور خدا کی مرضی کو مول لیتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جن پر خدا کی

رحمت ہے" ایسا ہی وہ شخص جو روحانی حالت کے مرتبہ تک
پہنچ گیا ہے۔ خدا کی راہ میں فدا ہو جاتا ہے۔ خدا تعالیٰ اِس
آیت میں فرماتا ہے کہ تمام دکھوں سے وہ شخص نجات پاتا ہے
جو میری راہ میں اور میری رضا کی راہ میں جان کو بیچ دیتا ہے
اور جانفشانی کے ساتھ اپنی اس حالت کا ثبوت دیتا ہے کہ وہ
خدا کا ہے اور اپنے تمام وجود کو ایک ایسی چیز سمجھتا ہے جو
طاعت خالق اور خدمتِ مخلوق کے لئے بنائی گئی ہے اور پھر
حقیقی نیکیاں جو ہر ایک قوت سے متعلق ہیں ایسے ذوق وشوق
اور حضورِ دل سے بجالاتا ہے کہ گویا وہ اپنی فرماں برداری کے
آئینہ میں اپنے محبوبِ حقیقی کو دیکھ رہا ہے اور ارادہ اس کا
خدا تعالیٰ کے ارادہ سے ہمرنگ ہو جاتا ہے اور تمام لذت
اس کی فرماں برداری میں ٹھہر جاتی ہے اور تمام اعمالِ صالح
نہ مشقت کی راہ سے بلکہ تلذذ اور احتظاظ کی کشش سے صادر
ہونے لگتے ہیں یہی وہ نقد بہشت ہے جو روحانی انسان کو
ملتی ہے اور وہ بہشت موعود جو آئندہ ملیگی درحقیقت اسی
کی اظلال و آثار ہے جس کو دوسرے عالم میں قدرتِ
خداوندی جسمانی طور پر متمثل کر کے دکھائیگی۔ اسی کی طرف

اشارہ ہے جو اللہ جل شانہ فرماتا ہے وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ
وَسَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُوْرًا ۔ اِنَّ الْاَبْرَارَ يَشْرَبُوْنَ مِنْ
كَاْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُوْرًا عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللّٰهِ يُفَجِّرُوْنَهَا
تَفْجِيْرًا ۔ يُسْقَوْنَ فِيْهَا كَاْسًا كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيْلًا عَيْنًا فِيْهَا
تُسَمّٰى سَلْسَبِيْلًا ۔ اِنَّا اَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِيْنَ سَلَاسِلَ وَاَغْلَالًا وَّ
سَعِيْرًا ۔ وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَ
اَضَلُّ سَبِيْلًا ۔ یعنی جو شخص خدا تعالیٰ کی طرف سے خائف ہے اور اس
کے عظمت و جلال کے مرتبہ سے ہراساں ہے اس کیلئے دو بہشت
ہیں ایک یہی دنیا اور دوسری آخرت اور ایسے لوگ جو خدا میں
محو ہیں خدا نے اُن کو وہ شربت پلایا ہے جس نے اُن کے
دل اور خیالات اور ارادات کو پاک کیا۔ نیک بندے وہ شربت
پی رہے ہیں جس کی ملونی کافور ہے وہ اس چشمہ سے پیتے ہیں
جس کو وہ آپ ہی چیرتے ہیں، میں پہلے بیان کر چکا ہوں کہ
کافور کا لفظ اس واسطے آیت میں اختیار کیا گیا ہے کہ لغت
عرب میں کفر دبانے اور ڈھانکنے کو کہتے ہیں، سو یہ اس بات
کی طرف اشارہ ہے کہ اُنھوں نے ایسے خلوص سے انقطاع اور
رجوع الی اللہ کا پیالہ پیا ہے کہ دنیا کی محبت بالکل ٹھنڈی
ہوگئی ہے۔ یہ قاعدہ کی بات ہے کہ تمام جذبات دل کے خیال
سے ہی پیدا ہوتے ہیں اور جب دل اِن نالائق خیالات سے

بہت دور چلا جائے اور کچھ تعلقات اُن سے باقی نہ رہیں تو وہ جذبات بھی آہستہ آہستہ کم ہونے لگتے ہیں یہاں تک کہ نابود ہو جاتے ہیں۔ سو اس جگہ خدا تعالیٰ کی یہی غرض ہے اور وہ اس آیت میں یہی سمجھاتا ہے کہ وہ اس کی طرف کامل طور سے جھک گئے اور نفسانی جذبات سے بہت ہی دور نکل گئے ہیں، خدا کی طرف ایسے جھکے کہ دنیا کی سرگرمیوں سے اُن کے دل ٹھنڈے ہو گئے اور اُن کے جذبات ایسے دب گئے جیسا کافور زہریلے مادوں کو دبا دیتا ہے، اور پھر فرمایا کہ وہ لوگ اس کافوری پیالہ کے بعد وہ پیالے پیتے ہیں جن کی ملونی زنجبیل ہے، اب جاننا چاہیئے کہ زنجبیل دو الفاظ سے مرکب ہے یعنی زنا اور جبل سے زنا، لغتِ عرب میں اوپر چڑھنے کو کہتے ہیں اور جبل پہاڑ کو اس کے ترکیبی معنے یہ ہیں کہ پہاڑ پر چڑھ گیا، واضح ہو کہ انسان پر ایک زہریلی بیماری کے فرو ہونے کے بعد اعلیٰ درجہ کی صحت تک دو حالتیں آتی ہیں۔ ایک وہ حالت جبکہ زہریلے مواد کا جوش بکلی جاتا رہتا ہے اور خطرناک مادوں کا جوش فرو باصلاح ہو جاتا ہے اور سمی کیفیات کا حملہ بخیر و عافیت گزر جاتا ہے اور ایک مہلک طوفان جو اٹھا تھا نیچے دب جاتا ہے۔ لیکن ہنوز اعضا میں کمزوری باقی ہوتی ہے کوئی طاقت کا کام نہیں ہو سکتا۔ ابھی مردہ کی طرح افتاں وخیزاں چلتا ہے، اور دوسری حالت وہ ہے

کہ جب اصل صحت عود کر آتی ہے اور بدن میں طاقت بھر جاتی ہے اور قوت کے بحال ہونے سے یہ حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے کہ بلا تکلف پہاڑ کے اوپر چڑھ جائے اور نشاطِ خاطر سے اونچی گھاٹیوں پر دوڑتا چلا جائے، سو سلوک کے تیسرے مرتبہ میں یہ حالت میسر آتی ہے، ایسی حالت کی نسبت اللہ تعالیٰ آیت موصوفہ میں اشارا فرماتا ہے کہ انتہائی درجہ کے باخدا لوگ وہ پیالے پیتے ہیں جن میں زنجبیل ملی ہوئی ہے۔ یعنی روحانی حالت کی پوری قوت پاکر بڑی بڑی گھاٹیوں پر چڑھ جاتے ہیں اور بڑے مشکل کام ان کے ہاتھ سے انجام پذیر ہوتے ہیں اور خدا کی راہ میں حیرت انگیز جانفشانیاں دکھاتے ہیں۔ اس جگہ یہ بھی واضح رہے کہ علم طب کی رُو سے زنجبیل وہ دوا ہے جس کو ہندی میں سونٹھ کہتے ہیں وہ حرارتِ غریزی کو بہت قوت دیتی ہے اور دستوں کو بند کرتی ہے اور اس کا نام زنجبیل اسی واسطے رکھا گیا ہے کہ وہ کمزور کو گویا ایسا قوی کرتی ہے اور ایسی گرمی پہنچاتی ہے جس سے وہ پہاڑوں پر چڑھ سکے، ان متقابل آیتوں کو پیش کرنے سے جن میں ایک جگہ کافور اور دوسری جگہ زنجبیل کا ذکر ہے خدا تعالیٰ کی یہ غرض ہے کہ اپنے بندوں کو سمجھائے کہ جب انسان جذباتِ نفسانی سے نیکی کی طرف حرکت کرتا ہے تو پہلے پہل اس حرکت کے بعد یہ حالت پیدا ہوتی ہے کہ اس کے

زہریلے مواد نیچے دبائے جاتے ہیں اور نفسانی جذبات رو بکمی ہونے لگتے ہیں جیساکہ کافور زہریلے مواد کو دبا لیتا ہے اسی لئے وہ ہیضہ اور محرقہ تپوں میں مفید ہے اور پھر جب زہریلے مواد کا جوش بالکل جاتا رہے گا اور ایک کمزور صحت جو ضعف کے ساتھ ملی ہوئی ہوتی ہے حاصل ہوجاتی ہے تو دوسرا مرحلہ یہ ہے کہ وہ ضعیف بیمار زنجبیل کے شربت سے قوت پاتا ہے اور زنجبیلی شربت خدا تعالیٰ کے حسن و جمال کی تجلّی ہے۔ جو روح کی غذا ہے جب انسان اس تجلّی سے قوت پاتا ہے تو پھر بلند اور اونچی گھاٹیوں پر چڑھنے کے لائق ہوجاتا ہے اور خدا تعالیٰ کی راہ میں ایسی حیرت ناک سختی کے کام دکھاتا ہے کہ جب تک یہ عاشقانہ گرمی کسی کے دل میں نہ ہو ہرگز ایسے کام نہیں کر سکتا سو خدا تعالیٰ نے اس جگہ اِن دونوں حالتوں کو سمجھانے کیلئے عربی زبان کے دو لفظوں سے کام لیا ہے ایک کافور جو نیچے دبانے والے کو کہتے ہیں اور دوسرے زنجبیل جو اوپر چڑھنے والے کو کہتے ہیں، اور اس راہ میں یہی دو حالتیں سالکوں کیلئے واقع ہوتی ہیں" باقی حصہ آیت کا یہ ہے۔ اِنَّآ اَعْتَدْنَا لِلْکٰفِرِیْنَ سَلٰسِلَ وَ اَغْلٰلًا وَّ سَعِیْرًا یعنی ہم نے منکروں کے لئے جو سچائی کو قبول کرنا نہیں چاہتے زنجیریں تیار کردی ہیں اور طوق گردن اور ایک افروختہ آگ کی سوزش" اس کا یہ مطلب ہے کہ

جو لوگ سچے دل سے خدا تعالیٰ کو نہیں ڈھونڈتے اُن پر خدا کی طرف سے رجعت ہوتی ہے وہ دنیا کی گرفتاریوں میں ایسے مبتلا رہتے ہیں کہ گویا پابہ زنجیر ہیں اور زمینی کاموں سے ایسے نگوں سار ہوتے ہیں گویا اُن کی گردن میں ایک طوق ہے جو اُن کو آسمان کی طرف سر اُٹھانے نہیں دیتا اور اُن کے دلوں میں حرص و ہوا کی ایک سوزش لگی ہوئی ہوتی ہے کہ یہ مال حاصل ہو جائے اور یہ جائداد مل جائے اور فلاں مُلک ہمارے قبضہ میں آ جائے اور فلاں دشمن پر ہم فتح پا جائیں اس قدر روپیہ ہو اتنی دولت ہو، سو چونکہ خدا تعالیٰ اُن کو نالائق دیکھتا ہے اور بُرے کاموں میں مشغول پاتا ہے اس لئے یہ تینوں بلائیں اُن کو لگا دیتا ہے، اس جگہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ جب انسان سے کوئی فعل صادر ہوتا ہے تو اُسی کے مطابق خدا بھی اپنی طرف سے ایک فعل صادر کرتا ہے مثلاً انسان جس وقت اپنی کوٹھری کے تمام دروازے بند کر دے تو انسان کے اس فعل کے بعد خدا تعالیٰ کا یہ فعل ہوگا کہ وہ کوٹھری میں اندھیرا پیدا کر دے گا کیونکہ جو امور خدا تعالیٰ کے قانونِ قدرت میں ہمارے کاموں کے لئے بطور ایک نتیجۂ لازمی کے مقدر ہو چکے ہیں وہ سب خدا تعالیٰ کے فعل ہیں، وہ یہ کہ وہی علت العلل ہے، ایسا ہی اگر مثلاً کوئی شخص زہر قاتل کھائے تو اُس کے اِس فعل کے بعد

خدا تعالیٰ کا یہ فعل صادر ہوگا کہ اُسے ہلاک کردیگا، ایسا ہی اگر کوئی ایسا فعل بجا کرے جو کسی متعدی بیماری کا موجب ہو تو اُس کے اس فعل کے بعد خدا تعالیٰ کا یہ فعل ہوگا کہ وہ بیماری اُس کو پکڑ لیگی پس جس طرح ہماری دنیوی زندگی میں صریح نظر آتا ہے کہ ہمارے ہر فعل کے لئے ایک ضروری نتیجہ ہے اور وہ نتیجہ خدا تعالیٰ کا فعل ہے۔ ایسا ہی دین کے متعلق بھی یہی قانون ہے، جیسا کہ خدا تعالیٰ اِن دو مثالوں میں صاف فرماتا ہے کہ

اَلَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا ۔ فَلَمَّا زَاغُوْا اَزَاغَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ ۔

یعنی جو لوگ اس فعل کو بجا لائے کہ انھوں نے خدا تعالیٰ کی جستجو میں پوری پوری کوشش کی تو اس فعل کے لئے لازمی طور پر ہمارا یہ فعل ہوگا کہ ہم اُن کو اپنی راہ دکھا دیں گے، اور جن لوگوں نے کجی اختیار کی اور سیدھی راہ پر چلنا نہ چاہا تو ہمارا فعل اُن کی نسبت یہ ہوگا کہ ہم اُن کے دلوں کو کج کردیں گے۔

پھر ایسی حالت کو زیادہ توضیح دینے کے لئے فرمایا۔
مَنْ کَانَ فِیْ ھٰذِہٖٓ اَعْمٰی فَھُوَ فِی الْاٰخِرَۃِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِیْلًا۔ یعنی جو شخص اس جہان میں اندھا رہا۔ وہ آنے والے جہان میں بھی اندھا ہوگا بلکہ اندھوں سے بدتر۔" یہ اس بات کی طرف اشارا ہے کہ نیک بندوں کو خدا کا دیدار اسی جہان میں ہوتا ہے اور وہ اسی جہان میں

اپنے اُس پیارے کا درشن پا لیتے ہیں جس کے لئے وہ سب کچھ کھوتے ہیں، غرض مفہوم آیت کا یہی ہے کہ بہشتی زندگی کی بنیاد اسی جہان سے پڑتی ہے اور جہنمی نابینائی کی جڑ بھی اسی جہان کی گندگی اور کورانہ زیست ہے۔"

پھر فرمایا کہ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ یعنی جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل بجالاتے ہیں وہ اُن باغوں کے وارث ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، پس واضح رہے کہ اس جگہ ایک اعلیٰ درجہ کی فلاسفی کے رنگ میں بتایا گیا ہے کہ جو رشتہ نہروں کا باغ کے ساتھ ہے وہی رشتہ اعمال کا ایمان کے ساتھ ہے پس جس طرح کوئی باغ بغیر پانی کے سرسبز نہیں رہ سکتا اسی طرح کوئی ایمان بغیر نیک کاموں کے زندہ ایمان نہیں کہلا سکتا اگر ایمان ہو اور اعمال نہ ہوں تو وہ ایمان ہیچ ہے اور اگر اعمال ہوں اور ایمان نہ ہو تو وہ اعمال ریاکاری ہیں، اسلامی بہشت کی یہی حقیقت ہے کہ وہ اِس دُنیا کے ایمان اور عمل کا ایک ظل ہے وہ کوئی نئی چیز نہیں جو باہر سے آکر انسان کو ملے گی بلکہ انسان کی بہشت انسان کے اندر سے ہی نکلتی ہے، اور ہر ایک کی

ہشت اُسی کا ایمان اور اُسی کے اعمالِ صالحہ ہیں جن کی
سی دُنیا میں لذت شروع ہو جاتی ہے اور پوشیدہ طور
پر ایمان اور اعمال کے باغ نظر آتے ہیں اور نہریں بھی
دکھائی دیتی ہیں لیکن عالمِ آخرت میں یہی باغ کھُلے طور
پر محسوس ہوں گے" خدا کی پاک تعلیم ہمیں یہی بتاتی ہے کہ
سچا اور پاک اور مستحکم اور کامل ایمان جو خدا اور اُس کی صفات
اور ارادوں کے متعلق ہو وہ بہشت خوشنما اور بارور درخت ہے
اور اعمالِ صالحہ اس بہشت کی نہریں ہیں، جیسا کہ وہ فرماتا ہے۔
مَثَلاً کَلِمَۃً طَیِّبَۃً کَشَجَرَۃٍ طَیِّبَۃٍ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا
فِی السَّمَآءِ تُؤْتِیْٓ اُکُلَھَا کُلَّ حِیْنٍ ہ یعنی ایمانی کلمہ جو ہر ایک
افراط اور تفریط اور نقص وخلل اور کذب و ہزل سے پاک اور
من کل الوجوہ کامل ہو وہ اس درخت کے ساتھ مشابہہ ہے جو
ہر عیب سے پاک ہو۔ جس کی جڑ زمین میں قائم اور شاخیں آسمان
میں ہوں اور پھر پھل ہمیشہ دیتا ہو کوئی وقت اُس پر ایسا نہیں
آتا کہ اُس کی شاخوں میں پھل نہ ہوں، اس بیان میں خدا تعالیٰ
نے ایمانی کلمہ کو ہمیشہ پھلدار درخت سے مشابہت دے کر اُس
کی تین علامتیں بیان فرمائیں۔ (۱) اول یہ کہ اُس کی جڑ جو اصل

مفہوم سے مراد ہے انسان کے دل کی زمین میں ثابت ہو۔ یعنی انسانی فطرت اور انسانی کانشنس نے اس کی حقانیت اور اصلیت کو قبول کر لیا ہو (۲) دوسری علامت یہ کہ اس کلمہ کی شاخیں آسمان میں ہوں یعنی معقولیت اپنے ساتھ رکھتا ہو اور آسمانی قانونِ قدرت جو خدا کا فعل ہے اس فعل کے مطابق ہو، مطلب یہ کہ اس کی صحت اور اصلیت کے دلائل قانونِ قدرت سے مستنبط ہو سکتے ہوں اور نیز یہ کہ وہ دلائل ایسے اعلیٰ ہوں کہ گویا آسمان میں ہیں۔ جن تک اعتراض کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا، (۳) تیسری علامت یہ کہ وہ پھل جو کھانے کے لائق ہے دائمی اور غیر منقطع ہو یعنی عملی مزاولت کے بعد اس کی برکات و تاثیرات ہمیشہ اور ہر زمانہ میں مشہود اور محسوس ہوتی ہوں یہ نہیں کہ کسی خاص زمانہ تک ظاہر ہو کر پھر آگے بند ہو جائیں۔" پھر فرمایا کہ وَمَثَلُ كَلِمَةٍ خَبِيثَةٍ كَشَجَرَةٍ خَبِيثَةٍ اجْتُثَّتْ مِنْ فَوْقِ الْأَرْضِ مَا لَهَا مِنْ قَرَارٍ یعنی پلید کلمہ اس درخت سے مشابہ ہے جو زمین سے اکھڑا ہوا ہو یعنی فطرتِ انسانی اس کو قبول نہیں کرتی اور کسی طور سے وہ قرار نہیں پکڑتا نہ دلائلِ عقلیہ کی رُو سے نہ قانونِ قدرت کی رُو سے نہ کانشنس کی رُو سے۔ صرف قصہ اور کہانی کے رنگ میں ہوتا ہے۔

قرآن شریف نے جس طرح عالم آخرت میں ایمان کے پاک درختوں کو انگور، انار، اور عمدہ عمدہ میووں سے مشابہت دی ہے اور بیان فرمایا ہے کہ اس روز وہ ان میووں کی صورت میں متمثل ہوں گے اور دکھائی دیں گے، اسی طرح بے ایمانی کے خبیث درخت کا نام عالم آخرت میں زقوم رکھا ہے، جیساکہ وہ فرماتا ہے أَذَٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا أَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّومِ إِنَّا جَعَلْنَاهَا فِتْنَةً لِّلظَّالِمِينَ ۝ إِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِي أَصْلِ الْجَحِيمِ طَلْعُهَا كَأَنَّهُ رُءُوسُ الشَّيَاطِينِ ۝ إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ طَعَامُ الْأَثِيمِ كَالْمُهْلِ يَغْلِي فِي الْبُطُونِ كَغَلْيِ الْحَمِيمِ ذُقْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْكَرِيمُ ۝ یعنی تم بتاؤ کہ بہشت کے باغ اچھے ہیں یا زقوم کا درخت جو ظالموں کے لئے ایک بلا ہے، وہ ایک درخت ہے جو جہنم کی جڑ میں سے نکلتا ہے (یعنی تکبر اور خود بینی سے پیدا ہوتا ہے یہی دوزخ کی جڑ ہے) اس کا شگوفہ ایسا ہے جیساکہ شیطان کا سر۔ (شیطان کے معنی ہیں ہلاک ہونے والا۔ یہ لفظ شیط سے نکلا ہے۔ پس حاصل کلام یہ کہ اس کا کھانا ہلاک ہوتا ہے، اور پھر فرمایا کہ زقوم کا درخت ان دوزخیوں کا کھانا ہے جو عمداً گناہ کو اختیار

کر لیتے ہیں وہ کھانا ایسا ہے اسلام اور دعاء فاتحہ
پانی کی طرح پیٹ میں جوش کی راہ میں وقف کر دیتا
فرماتا ہے کہ) اس درخت کو سورۂ فاتحہ میں مسلمانوں کو
کلمہ نہایت غضب کا ہے اس تک یہ دونوں چیزیں ہیں یعنی
اور اپنی بزرگی اور عزت کا پارا تک پہنچنے اور حقیقی نجات
آج یہ تلخیاں تجھے اٹھانی نہ اعلیٰ ذریعہ ہے جو قانون
بھی اشارا ہے کہ دراصل یہ دور وصالِ الٰہی کے لئے
ہے اور اُم اِنَّکَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ ہیں جو اسلام کے مفہوم
ایک حرف پہلے کا اور ایک حا اور دعاء فاتحہ میں لگے ہیں
استمال نے فنال کوزا کے سا، آگ جو ہماری سفلی زندگی
ہے کہ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے معبودوں کو جلا کر سچے اور
کے ساتھ مشابہت دی ایسا ہو اور ہمارا مال اور ہماری آبرو
کلمات کو زقوم کے ساتھ مشابہ چشمے میں داخل ہو کر ہم
ٹھہرایا اور ظاہر فرمادیا کہ بہشت اور ہماری تمام رُوحانی
شروع ہوتی ہے جیسا کہ دونا جیسا کہ ایک رشتہ دوسرے
فرماتا ہے۔ نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ تعالیٰ آگ کی طرح ایک آگ
وہ آگ ہے جس کا منبع خدا کا ایک آگ اوپر سے ہم پر
ہے اور پہلے دل پر غالب ہونے ملنے سے ہماری تمام ہوا
ہے کہ اس آگ کی اصل جڑ جاتی ہے اور ہم اپنی پہلی

زندگی سے مر جاتے ہیں، اس حالت کا نام قرآن شریف کی رُو سے اسلام ہے، اسلام سے ہمارے نفسانی جذبات کو موت آتی ہے۔ اور پھر دعا سے ہم از سرِ نو زندہ ہوتے ہیں اس دوسری زندگی کے لئے الہامِ الٰہی ہونا ضروری ہے اس مرتبہ پر پہنچنے کا نام لقاء الٰہی ہے، یعنی خدا کا دیدار اور خدا کا درشن اس درجہ پر پہنچکر انسان کو خدا سے وہ اتصال ہوتا ہے گویا وہ اس کو آنکھ سے دیکھتا ہے اور اس کو قوت دی جاتی ہے اور اس کے تمام حواس اور تمام اندرونی قوتیں روشن کی جاتی ہیں اور پاک زندگی کی کشش بڑے زور سے شروع ہو جاتی ہے، اسی درجہ پر آکر خدا انسان کی آنکھ ہو جاتا ہے جس سے وہ دیکھتا ہے، اور زبان ہو جاتا ہے جس کے ساتھ وہ بولتا ہے، اور ہاتھ ہو جاتا ہے جس کے ساتھ وہ حملہ کرتا ہے، اور کان ہو جاتا ہے جس کے ساتھ وہ سنتا ہے اور پیر ہو جاتا ہے جس کے ساتھ وہ چلتا ہے، اس درجہ کی طرف اشارہ ہے جو خدا فرماتا ہے:۔ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْھِمْ یہ اس کا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے جو اُن کے ہاتھوں پر ہے، اور ایسا ہی فرماتا ہے:۔ مَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی۔ یعنی جو تو نے چلایا تو نے نہیں بلکہ خدا نے چلایا" غرض اِس درجہ پر خدا کے ساتھ کمال اتحاد ہو جاتا ہے اور اللہ تعالٰی کی

پاک مرضی روح کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتی ہے، یہ معنی اس آیت کے ہیں جو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔ وَ اَیَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ اس مرتبہ میں محبت اور عشق کی نہریں ایسا جوش مارتی ہیں کہ خدا کے لیئے مرنا اور خدا کے لیئے ہزاروں دکھ اٹھانا اور بے آبرو ہونا ایسا آسان ہو جاتا ہے گویا ایک ہلکا سا تنکا توڑا ہے، خدا کی طرف کھنچا چلا جاتا ہے اور نہیں جانتا کہ کون کھینچ رہا ہے، ایک غیبی ہاتھ اس کو اٹھائے پھرتا ہے اور خدا کی مرضیوں کو پورا کرنا اس کی زندگی کا اصل الاصول ٹھہر جاتا ہے، اس مرتبہ میں خدا نہایت ہی قریب دکھائی دیتا ہے جیسا کہ اس نے فرمایا ہے:۔ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ۔ یعنی ہم اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ نزدیک ہیں، ایسی حالت میں اس مرتبہ کا آدمی ایسا ہوتا ہے جس طرح پھل پختہ ہو کر خود بخود درخت گر جاتا ہے اسی طرح اس مرتبہ کے آدمی کے تمام تعلقات سفلی کالعدم ہو جاتے ہیں، اس کا اپنے خدا سے ایک گہرا تعلق ہو جاتا ہے اور وہ مخلوق سے دور چلا جاتا ہے اور خدا کے مکالمات اور مخاطبات سے شرف پاتا ہے، اس مرتبہ کے حاصل کرنے کے لئے اب بھی دروازے کھلے ہیں جیسا کہ پہلے کھلے تھے اور اب بھی خدا کا فضل یہ نعمت ڈھونڈھنے والوں کو دیتا ہے جس طرح پہلے دیتا تھا، مگر یہ راہ محض زبان کی فضولیوں کے

ساتھ حاصل نہیں ہوتی اور فقط بے حقیقت باتوں اور لافوں سے یہ دروازہ نہیں کھلتا۔ چاہنے والے بہت ہیں مگر پانے والے کم، اس کا یہ سبب ہے کہ یہ مرتبہ سچی گرمی اور سچی جاں فشانی پر موقوف ہے۔ باتیں قیامت تک کیا کرو! کیا ہو سکتا ہے؟ صدق سے اُس آگ پر قدم رکھنا جس کے خوف سے لوگ بھاگتے ہیں۔ اس راہ کی پہلی شرط یہ ہے کہ اگر عملی سرگرمی نہیں تو لاف زنی ہیچ ہے۔ اِس بارہ میں اللہ جل شانہ فرماتا ہے۔ وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ۝ یعنی اگر میرے بندے میری نسبت سوال کریں۔ کہ وہ کہاں ہے؟ تو اُن کو کہہ دے کہ وہ تم سے بہت ہی قریب ہے، میں دُعا کرنے والوں کی دُعا سنتا ہوں، پس چاہیئے کہ وہ دعاؤں سے میرا وصل ڈھونڈیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ کامیاب ہوں"

محمد جمیل احمد خاں
کوکب (شاہجہاں پور)